فہرست

لمعات:

الحمدللہ علیٰ ذلک		3
مطالب القرآن فی دروس الفرقان (۲۹واں پارہ)	غلام احمد پرویزؒ	4
دین میں انفرادی پرستش کی اجازت نہیں ہے	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی، کراچی	18
فنا اور بقا	جمیل احمد عدیل، بورے والا	28
آغازِ سُخن (سورۃ یٰسٓ)	شیخ اللہ دتا، لاہور	40
حرفِ تمنا	محمد اشرف ظفر، لاہور	42
اقبالؒ کے فلسفہ خودی کے ارتقاء سے متعلق ایک تصور	محمد علی صابر صدیقی، پشاور	47
نقد و نظر	ڈاکٹر طاہر انیس، لاہور	50

حدیث نبوی ﷺ

روایت ہے کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی: اتَّخَذُوٓاْ أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ (9:31)۔ یہود اور نصاریٰ نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا بنا لیا تھا تو عدیؓ بن حاتم نے کہا کہ وہ لوگ ان کی پرستش تو نہیں کرتے۔ پھر انہوں نے انہیں خدا کیسے بنا لیا تھا؟ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا یہ واقع نہیں کہ جس چیز کو ان کے علماء و مشائخ حلال قرار دیتے تھے یہ لوگ اسے حلال سمجھ لیتے تھے اور جسے وہ حرام قرار دے دیتے تھے اسے حرام۔ یہی علماء اور مشائخ کو خدا بنا لینا ہے۔ (ترمذی بحوالہ ابن کثیر)۔

حضرت عوفؓ بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے سب سے بہتر حاکم وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں۔ تم ان کے لئے دعا کرو اور وہ تمہارے لئے دعا کریں اور تمہارے بدترین حاکم وہ ہیں کہ ان سے بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں۔ تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔ (مسلم بحوالہ ریاض الصالحین)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمحات

الحمد للہ علیٰ ذلک

ایک مدت کے بعد اہل پاکستان کو خبرِ خوش نصیب ہوئی ہے کہ ہماری سیاسی قیادت نے ایک رائے اور موقف اختیار کیا ہے۔ یہ امر بلاشبہ خوش آئند اور امید افزا ہے کہ کل جماعتی کانفرنس میں شریک تمام جماعتوں نے (ایک آدھ کٹ حجت گروہ کے استثناء کے ساتھ) سوات آپریشن کے حوالے سے حکومتی موقف کی تائید وحمایت کی اور اسے پوری قوم کے دل کی آواز قرار دیا۔ لیکن اس موقع پر یہ بھی ضروری ہے کہ متفقہ قرارداد کی منظوری کے بعد تمام سیاسی جماعتیں مطمئن ہوکر نہ بیٹھ جائیں۔ کیونکہ اب ان پر دو اہم ذمہ داریاں عائد ہوگئی ہیں۔ ایک یہ کہ 30 لاکھ کے لگ بھگ نقل مکانی کرنے والے افراد کی بحالی تک انہیں اپنی سرگرمیوں کی منظّم منصوبہ بندی کرنا ہوگی۔ دوسرا یہ کہ اس مسئلہ کے پرامن حل کے آپشن کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے اپنے کارکنوں کو دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خلاف حرکت میں لانا ہوگا۔ اسلام اور مملکت پاکستان کے خلاف ان عناصر کے دل ودماغ جیتنے کے لئے ایک نتیجہ خیز پروگرام ترتیب دینے میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔ تمام سیاسی جماعتوں' ادیبوں' دانشوروں' نجی فلاحی اداروں' ماہرینِ تعلیم' ماہرین عمرانیات ومعاشیات' پوری سول سوسائٹی کو اب اپنی قومی ذمہ داری سمجھتے ہوئے عوامی سطح پر اعتدال پسندی اور میانہ روی کی ضرورت اور اہمیت کے احساس کو پیدا کرنے کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہوگا اور اس ملک کے عام آدمی کو طالبان اور عسکریت پسندوں کی سرگرمیوں اور ان کے پس پردہ عوامل ومحرکات سے متعلق آگاہی اور شعور دیتے ہوئے نہایت مدلل اور معقول انداز میں سمجھانا ضروری ہے کہ اس قسم کی سرگرمیوں اور اس اندازِ فکر ونظر کا خالص قرآن کی روشنی میں' حقیقی اسلام سے بالکل کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ اسلام تو حُسنِ سلوک' اعتدال' میانہ روی' امن اور سلامتی کا دین ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الجن

(آیات16 تا22)

عزیزانِ من! آج جنوری1984 کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الجن کی آیت 16 سے ہو رہا ہے: (72:16)۔ سابقہ آیات میں یہ بتایا گیا تھا کہ صحرا نورد بادیہ نشین بدوؤں کے قبیلے کے کچھ لوگوں نے قرآن سنا' پھر انہوں نے جا کر اپنے قبیلے کے باقی لوگوں کو یہ بتایا کہ ہم کیا ہی ایک عجیب وغریب پیغام سن کر آئے ہیں۔ اس تعلیم کا ملخص سن کر ان میں سے بعض لوگ ایمان بھی لے آئے۔ اس پر ان پہلی پندرہ آیات میں انہی کا ذکر تھا اور انہی کی وہ باتیں تھیں جو جا کر انہوں نے اپنے قبیلے والوں سے کہیں۔ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ اب بات یہاں پر اِدھر کی شروع ہو رہی ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ اے رسول اللہ! ان سے کہہ دیجیے کہ **وَاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا o لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ط وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا** (72:16-17) جو صحیح طریقے پر استقامت سے چلتا رہے گا ان کی زندگیوں میں سیرابیاں اور شادابیاں آئیں گی۔ یہ ہے وہ کھلا ہوا معیار جس کے مطابق یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خدا کے راستے پر چلنے والے کون ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص اپنے خدا کے قانونِ ربوبیت سے روگردانی کرتا ہے وہ سخت مصیبت میں مبتلا رہتا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ عربوں کے ہاں تو پانی ان کے لیے نعمتِ کبریٰ تھی۔ اس لیے قرآنِ کریم نے سایہ دار درخت' پانی کی نالیوں یا ندیوں کا شمار ان نعماء میں کیا ہے جسے کہا ہے کہ یہ جنت کی نعمت ہے۔ قرآن نے اس پہلی اولیں مخاطب قوم کو سمجھانے کے لیے یہ ساری چیزیں بتائی اور یہ شاداب وسیراب تو ویسے بھی زبان کے محاورے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی شاداب وسیراب نعما میں سے گنی جاتی ہے۔ اب اگلی بات یہ ہے کہ جو خدا کے قوانین سے اعراض برتتا ہے' اس پر سخت قسم کی تباہی مسلط ہو جاتی ہے۔ یہاں صرف اسے

عذاب ہی بتایا ہے۔

قوانینِ خداوندی سے اعراض کا نتیجہ روزی کی تنگی کی شکل میں ہوتا ہے

قرآنِ کریم کے سمجھنے کا طریقہ تو اب آپ کو معلوم ہے کہ جو بات ایک جگہ کہیں مجمل طریق پہ بیان ہوتی ہے اس کی تشریح اور تفسیر دوسرے مقام پہ کی جاتی ہے۔ اب یہ خدا کے ذکر سے جو اعراض ہے وہ یہاں خدا کے قوانین سے اعراض برتنا ہے۔ اس کے لیے یہاں کہا ہے کہ سخت قسم کا' جاں گسل قسم کا' ایک عذاب ہے جو اس پر مسلط ہو جاتا ہے اور خدا کے ذکر سے اعراض برتنے سے جو عذاب مسلط ہوتا ہے یہ کہہ کر اس کی تشریح دوسری جگہ کر دی کہ **وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ** (20:124) جو ہمارے قوانین سے اعراض برتتا ہے **تو فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا** (20:124) اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ قوانینِ خداوندی کے اعراض کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اس قوم کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ یاد رکھیے! قرآن کی رو سے بھوک اور خوف خدا کے عذاب ہیں۔ سورۃ نحل میں یہ چیز موجود ہے۔ اس آیت (72:17) میں وہی الفاظ ہیں جو (20:124) میں آئے ہیں۔ تو یہاں کہا کہ خدا کے قوانین سے اعراض برتنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم کی روزی تنگ ہو جاتی ہے: بھوک' فکر' افلاس' یہ مسلط ہو جاتا ہے۔

عزیزانِ من! اگلی بات یہ آئی ہے کہ جو قوم اس بھوک' فکر' افلاس پہ مطمئن ہو جائے اور اپنا نظریہ زندگی ہی یہ اعتقاد بنا لے کہ یہ کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ اور اسے خدا کی رحمت شمار کرنے لگ جائے **تو فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی** (20:124) یہاں بھی اس کی روٹی تنگ ہو گی اور قیامت کے دن وہ اندھا اٹھایا جائے گا: یہ زندگی بھی ذلت اور خواری کی زندگی اور اخروی زندگی بھی نابینائی کی زندگی۔

امارت کے سہارے جنت کا حصول

یہ بھوک اور افلاس کا وہ عذاب ہے' جس کے متعلق پھر لوگوں کو مطمئن رکھنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ سب خدا کی طرف سے آتا ہے' یہ دونوں طبقے خدا نے پیدا کر دئے ہیں' غریب بھی اس نے پیدا کیے' امیر بھی اسی نے پیدا کیے اور اس کے جواز کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ غریب اور بھوکے نہ رہیں تو صدقہ اور خیرات کس کو دیا جائے یعنی امیر جنت خریدنے کے لیے جو صدقہ اور زکوٰۃ دیتے ہیں اُسے لینے والے کوئی ہونے چاہئیں کیونکہ اگر یہ نہ رہیں تو پھر وہ جنت کس طرح سے خریدیں گے۔ گویا یہ سب کچھ' جو کچھ بھی ہے: یہ دین' یہ قرآن' یہ اسلام' یہ سب کچھ' دولت مند طبقے کے لیے ہی ہے' Directly یا Indirectly (بالواسطہ یا بلا واسطہ) ان کے لیے ہی حصولِ مراعات کا ذریعہ ہے۔ یہاں بھی وہ سب کچھ دولت کے زور پر خریدتے چلے جائیں' لیتے جائیں' اور وہ قیامت میں بھی پھر یہ کچھ کہیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ اگر غریب نہ رہیں تو وہ صدقہ زکوٰۃ کس کو دیا جائے۔ تو یہ غریبوں کا طبقہ رہنا ضروری ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ سرمایہ داری کا نظام اور ملوکیت کا نظام کہاں پہنچا دیتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ روزی کا تنگ ہوجانا خدا کا عذاب ہے اور جس کا یہاں رزق تنگ ہوجائے اور پھر وہ اس قسم کے عقائد وضع کر لے تو پھر وہ قیامت میں بھی اندھا ہی اٹھایا جائے گا۔ تو یہ اعراض برتنا کہا ہے: وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا (72:17) جو شخص اپنے خدا کے قانونِ ربوبیت سے روگردانی کرتا ہے، وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

آیات کے غلط مفہوم کا نتیجہ

اب یہاں (72:17) میں ذکرِ رب خدا کے قوانین سے اعراض برتنے کا آیا ہے۔ اس کے بالکل Opposite، یعنی اس کے برعکس، تمسک، اطاعت، فرمانبرداری، قوانینِ خداوندی کی اطاعت کی کیفیت ہوتی ہے۔ اگلی آیت میں ساتھ یہ بات کہی کہ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا [1] (72:17)۔ عزیزانِ من! اگلی تین آیتیں بھی اس کے ساتھ ہی آئی ہیں: وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا o قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا [2] (72:17)۔ یہ عظیم آیات ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی انداز زیادہ موزوں رہے گا کہ پہلے میں قرآن کی رو سے، صحیح اسلام کی رو سے، عرض کروں کہ ان آیات کا مطلب کیا ہے اور بعد میں پھر یہ بات آئے کہ جب یہ دین اسلام کی بجائے مذہب بن گیا تو اس کی رو سے ان آیات کا مطلب کیا ہوگیا، جس سے بھوک اور پیاس بھی خدا کی رحمت شمار ہونے لگی۔

آپ کو یاد ہوگا میں اکثر مغربی فلاسفر کا یہ قول دہرایا کرتا ہوں کہ اگر آپ مجھے یہ بتا دیں کہ فلاں قوم نے کس قسم کا معبود اپنے لیے تجویز کر رکھا تھا، تو میں بتا دوں گا کہ اس قوم کی تہذیب، تمدن، معیشت، ثقافت کس قسم کی ہے۔ اس نے یہ بڑی اہم بات کہی ہے۔ اس نے تو کہا ہے کہ اس نے کس قسم کا معبود تجویز کر رکھا تھا، اپنے لیے کس قسم کا خدا بنا رکھا تھا تو اس سے میں زندگی کی اصل بنیاد بتا دونگا۔

---

[1] اطاعت وفرماں پذیری صرف قوانینِ خداوندی کی ہوسکتی ہے۔ جھکنا صرف انہی قوانین کے سامنے چاہیے۔ اس کے ساتھ کسی اور کے قانون کو شامل نہیں کرنا چاہیے۔ کسی اور کی اطاعت اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] (ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ خود خدا کے قوانین کے سامنے جھکنا تو ایک طرف) جب خدا کا ایک بندہ (رسول اللہؐ) اس دعوت کو لے کر اٹھا تو یہ لوگ مخالفتوں کے ہجوم کے ساتھ اس پر یوں امڈ پڑے گویا اسے کچل ہی ڈالیں گے (22:72)۔ ان سے کہہ دو کہ میرا ''جرم'' اس کے سوا کیا ہے کہ میں خود بھی خالص قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتا ہوں اور تمہیں بھی اس کی دعوت دیتا ہوں، اور اس میں کسی دوسرے کے قانون اور فیصلے کو شریک نہیں کرتا۔ (ایضاً)

قرآنِ کریم کی رو سے یہ کہیے کہ دین کا نکتہ ماسکہ یا محور جس کے گرد اس کی ساری تعلیم گردش کرتی ہے' خدا کا صحیح تصور ہے' اور خدا کا صحیح تصور وہ ہوگا جو اس نے خود اپنے متعلق بتایا ہے۔ وہ تصور اگر صحیح طور پر ذہنوں میں ہو' عقیدے میں ہو' نظریئے میں ہو' زندگی میں ہو' تو پھر ساری زندگی اور پورے کا پورا معاشرہ دین کے مطابق ہوتا ہے' قرآن کے مطابق ہوتا ہے۔ اور اگر یہ صحیح تصور اپنے مقام سے ہل جائے یعنی خدا کا تصور قرآنی نہ رہے تو پھر اسلام کی کوئی چیز بھی باقی نہیں رہتی۔

ایمان باللہ کا مفہوم

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم نے پہلے ہی پارے' پہلے ہی ورق سے آخری پارے' آخری ورق تک' سارا زور ایمان باللہ پہ دیا ہے۔ یہ ایمان باللہ کیا ہے؟ ہمارے ہاں والی بات آ گئی' تو آگے مذہبِ مُلّا آ جائے گا۔ اُس میں بس اٰمنوا باللہ کہا تو وہ خدا پر ایمان ہو گیا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ ہم نے تو کبھی وہ **امنوا باللہ** کا سوچا ہی نہیں' ہم تو پیدائشی مسلمان ہیں۔ کبھی کبھی پرانے زمانے میں نکاح کے وقت ملا چھ کلمے پڑھا دیا کرتا تھا' اب وہ چیز بھی نہیں رہی۔ اب تو بس فارم پہ دستخط ہی کر دینے کافی ہو جاتے ہیں۔ تو اب وہ **امنوا باللہ** کے معنی ہو گئے: خدا پر ایمان۔ آپ نے کبھی سوچا کہ آیا ہماری زندگیوں پر اس کا کوئی اثر بھی مرتب ہوتا ہے۔ جب ہم یہ کہہ رہے ہوتے ہیں تو ہم ان الفاظ کے معنی ہی نہیں سمجھ رہے ہوتے کہ اس کا زندگی پہ کیا اثر ہونا ہے۔ دین کی ساری بنیاد اس **امنوا باللہ** پر ہے۔ یوں کہیے کہ الدین کی' انسانی زندگی کی' ساری بنیاد اس پر ہے کہ اس میں خدا کا تصور کس قسم کا ہے۔

اللہ کا جو لفظ ہے وہ ''ال الٰہ'' ہے۔ الہ کے معنی ہوتے ہیں: ''وہ جس کی محکومیت اختیار کی جائے'' جسے اتھارٹی کہا جاتا ہے اور ال الہ ہے: The only authority' صرف وہی حاکم ہے۔ اللہ کے معنی ہیں: حقِ حکومت صرف اسی کو حاصل ہے' وہی ایک حاکم ہے۔ اس کی محکومیت کا نام ایمان باللہ ہے اور خالص اسی کی محکومیت کے معنی ہیں کہ اس میں کسی اور کی محکومیت کو شامل ہی نہ کیا جائے۔ یعنی یہ وہ ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن کی رو سے کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں ہے۔ اگر کسی انسان کی حکومت کا تصور کیا جائے یا اس کے احکام کی اطاعت کی جائے تو یہ شرک ہے۔ اس طرح کسی انسان کے قانون یا حکم کی اطاعت شرک ہے۔ اطاعت صرف خدا کے احکام کی ہے۔ اللہ کا جو صرف ''ال الٰہ'' کا تصور ہے' اس میں یہ چیز آ جاتی ہے۔ جب یہ کہیں گے کہ میں اسے مانتا ہوں' تسلیم کرتا ہوں' تو یہ وہی ہے جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ میرا ایمان یہ ہے کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے اور میں اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کرتا۔ یہ ہوا ایمان باللہ کا بنیادی مفہوم۔ اب اس کے گرد ساری چیز گردش کرے گی: وہ حاکم الٰہ' انسان عبد' محکوم۔ تو عبادت کے معنی ہوئے: خدا کی محکومیت اختیار کرنا اور عبد ہوا: خدا کی محکومیت اختیار کرنے والا اور سجدہ ہوا' اس کی عملی تعبیر۔

حقیقی نظریہ خدا کی محکومیت تھا

اس طرح ایک عقیدہ' ایک نظریہ' خدا کی محکومیت اختیار کرنا تھا۔ اس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا سجدہ ہوا۔ وہ مراکز جہاں خدا کی اطاعت کے عملی پروگرام طے ہوں' ان پر عمل کرنے کے طریقے سوچے جائیں' Discussions (گفتگو' تبادلہ خیال) ہوں' بحثیں ہوں' وہ ہوئی مسجد۔ جب یہ کہا گیا کہ ''محکومیت صرف خدا کی ہے' حکومت صرف خدا کی ہے'' تو اس کے ساتھ ہی یہ بات واضح ہوگئی کہ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ (72:18) مساجد وہ مراکز ہیں جہاں بیٹھ کر یہ پروگرام اور اس کی عملی تنفیذ طے کی جائے' Discussion (گفتگو' تبادلہ خیال) کی جائے' بحث وتمحیص کی جائے' جو خدا کی گورنمنٹ کا Secretariat (سیکرٹیریٹ' معتمدی) ہو تو وہاں تو خدا کی حاکمیت کے سوا کوئی دوسری بات ہی نہیں ہوسکتی۔ اگر وہاں کسی اور کے حقِ حکومت کو بھی تسلیم کیا جائے' وہاں بات یہ کی جائے کہ اس قانون میں کچھ خدا کا لے لیجیے مثلاً نماز اس کی پڑھ لیجیے اور کاروبارِ معیشت بہرحال دنیا کے کاروبار کی طرح کر لیجیے' تو یہ تو شرک ہوگا' یہ مساجد اللہ نہیں رہیں گی' مسجد للہ وہ رہے گی جہاں صرف یہ ہو کہ خدا کے احکام کو نافذ کرنے کے لیے' اس کی اطاعت کرنے کے لیے' کیا تدابیر ہوں' کیا طریقے ہوں' کیا سسٹم ہو' کیا نظام ہو۔ اور یہ جو خدا کے احکام کی اطاعت کرنے کا نظام ہے' اسے کہتے ہیں نظامِ صلوٰۃ۔ صلوٰۃ کے معنی ہوتے ہیں: کسی کے پیچھے پیچھے اس طرح چلے جانا کہ اُس کے اور اپنے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو' کوئی گیپ نہ ہو' مسلسل التزاماً کسی کے پیچھے چلے جانا۔

خدا کو پکارنے سے کیا مراد ہے

یہ ہوا مساجد کا اللہ کے لیے ہونا۔ یہ زندگی کا ایک نظام ہوا' حکومت کا طریق ہوا' مملکت کی وجہ جواز ہوئی کہ احکامِ خداوندی کی اطاعت کس طرح کی جائے' کیا طریق ہو کیونکہ یہ ایک اجتماعی چیز ہے۔ دین کے معنی ہیں: وہ اجتماعی نظام جس میں یہ طے کیا جائے کہ خدا کے احکام کی اطاعت کیسے کی جائے' ان کو نافذ کیسے کیا جائے' ان کو عام کیسے کیا جائے اور اطاعت اس انداز کی کی جائے کہ کوئی بھی معاملہ درپیش ہو' اس میں یہ غور کیا جائے' یہ سوچا جائے کہ اس کی بابت خدا کا حکم کیا ہے۔ اسے کہتے ہیں: خدا کو پکارنا' جس کے معنی اب آ گئے اس کی طرف رجوع کرنا' عام نظامِ حکومت میں بھی آپ دیکھیے کہ جب کوئی مسئلہ پیش ہوگا' کوئی معاملہ درپیش ہوگا' تو یہ دیکھا جائے گا کہ اس کے لیے Law (قانون) کونسا ہے' Regulations (قواعد وضوابط) کونسے ہیں' حکومت نے اس کے متعلق کیا طے کیا ہے۔ اس کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔ اسے کہتے ہیں: دعوت الی اللہ۔

دعوت الی اللہ کا مفہوم

عام الفاظ میں اب ہمارے ہاں تو اس کا ترجمہ ''پکارنا'' ہی رہ گیا ہے۔ یہ عام الفاظ میں وہ ہے جسے ہم ''رجوع کرنا'' کہتے ہیں یا جسے ہم انگریزی میں Refer it to him کہتے ہیں۔ کوئی معاملہ پیش ہو اس کے متعلق یہ بات طے کی جائے کہ بھئی! اس کے متعلق خدا کا حکم کیا ہے تو پھر آگے بات چلے گی' پھر Discussion (بحث وتمحیص) بھی ہوگی کہ اس کو نافذ کیسے کیا جائے' اس پہ عمل کیسے کیا جائے۔ یہ تمام امور جس مقام پہ' جس پارلیمنٹری ہاؤس میں' طے ہوتے تھے' اسے ''مسجد'' کہا جاتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے لیے ایک مرئی چیز' جسے ہم نماز کی شکل کہتے ہیں' وہ بھی ابتداً اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ یہ بالکل اسی طرح سے تھا جس طرح اب ہمارے ہاں جلسے ہوتے ہیں تو ان میں رسماً تلاوتِ قرآنِ کریم کر دیتے ہیں۔ اب تو ساری باتیں ہی رسماً رہ گئی ہیں۔ بہرحال ابتدا اس سے کی جاتی ہے۔ اسلام اس نظامِ حکومت کا نام ہے جس میں اطاعت خالص خدا کے احکام کی ہوتی ہے۔ یہ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ❶ (7:29) ہے۔ اور آگے چلیے۔ اس سے بھی واضح تر الفاظ میں سورۃ الانعام کی دو آیات میں کہا کہ قُلْ اِنِّىْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (6:56) ان سے کہہ دو کہ مجھے اس سے منع کیا گیا ہے' روکا گیا ہے' کہ یہ لوگ جو خدا کے سوا دوسروں کی اطاعت' محکومیت اختیار کرتے ہیں میں بھی ویسا ہی کروں۔ قطعاً نہیں' مجھے اس سے روکا گیا ہے۔ اس کے آگے یہ ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ❷ (6:57)۔ اس آیت میں تو ''حکم'' کا لفظ بھی آ گیا کہ حکومت کا حق تو صرف خدا کو حاصل ہے۔ قرآن کی بنیاد ہی اس دعوے پہ ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (6:57)۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے:

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے

یہ وہی چیز ہے جسے مفکرِ اسلام ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) نے بزبانِ شعر کہا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ''داع'' کیسا تھ واضح کر دیا کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (6:57) جس کے لفظی معنی آپ ''پکارنا'' کہیں گے۔ اس کے معنی ہونگے: احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنا' خدا کی محکومیت قبول کرنا' اختیار کرنا۔ دوسرے مقام پہ بھی ذرا اور واضح الفاظ میں آیا ہے کہ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ❸ (28:87)۔ بات ہی یہاں سے شروع ہوئی ہے کہ مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ❹ (28:88) خدا

---

❶ اطاعت کو اسی کے الدین کے لیے خاص کر دو۔
❷ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔
❸ مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔
❹ تم کسی دنیاوی اقتدار کو اس کی دعوت نہ دو کہ وہ اقتدارِ خداوندی کے ساتھ شریک ہو جائے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کے ساتھ کسی اور کو الٰہ نہ بناؤ۔ میں نے ابھی چند منٹ پہلے عرض کیا تھا اور اب یہاں تدع (28:88) کا لفظ آ گیا۔ چند منٹ پہلے کہا یہ تھا کہ لَا اِلٰـــہَ اِلَّا ھُوَ (28:88) الٰہ صرف وہی ہے The only Authority ہے۔ میں نے کہا تھا کہ صرف اس کو حقِ حکومت حاصل ہے، حاکم وہی ہے اور اسی آیت میں آگے پھر وہی لفظ آیا ہے: لَهُ الْحُكْمُ (28:88) حق حکومت صرف اس کے لیے ہے۔ لہ الحکم نے واضح کر دیا، دعوت الی اللہ کے معنی بھی واضح ہو گئے، صلوٰۃ کے معنی بھی واضح ہو گئے، مسجد کے معنی بھی واضح ہو گئے، شرک کے معنی بھی واضح ہو گئے کہ لَـهُ الْـحُكْمُ (28:88) حق حکومت صرف اس کے لیے ہے۔ اب یہ جتنے عناصر بھی میں نے ابھی آپ کو گنائے ہیں، یہ سارے اِنِ الْـحُـكْـمُ اِلَّا لِـلّٰـهِ (6:57) کی تفسیر، تشریح اور عملی پروگرام کی تکمیل کے لیے ہیں۔ حقِ حکومت، اطاعت یعنی Obedience صرف خدا کے احکام کی ہے۔ یہ ہوا الدین، یہ ہوا الاسلام۔ اگر کسی اور کا حقِ حکومت تسلیم کیا تو یہ شرک ہے۔ خدا کے احکام کے ساتھ کوئی اور احکام بھی ملا لیے، کسی انسانوں کے وضع کردہ احکام ملا لیے تو یہ ہوا شرک۔ دعوتِ الی اللہ خالصتاً اس کی، اطاعت اس کے احکام کی، صرف اس کے احکام کی محکومیت، دعوت الی اللہ ہے۔ مساجد وہ مراکز ہیں جہاں خدا کی حکومت سے متعلق معاملات طے ہوں۔ عبادت ''خدا کی محکومیت اختیار کرنا، اس کی اطاعت اختیار کرنا ہے۔'' اس اعتبار سے آپ دیکھیے گا کہ ان الفاظ کے یہ معنی عربی زبان کی رو سے بھی ہیں۔ خود قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر ان کی وضاحت کی گئی ہے اور خدا کے یہ معنی متعین کیے گئے ہیں۔ جب یہ اسلام دین تھا تو اس میں ان احکام کے یہی معنی لیے جاتے تھے، دین پر عمل کے بھی یہی معنی تھے کہ خدا کے احکام کی خود اطاعت کرنا، دوسروں سے کرانا، ان کا نفاذ کرنا، ان کی تنفیذ کرنا، عملاً یہی مقصود و مفہوم اور مطلوب تھا۔ دین قائم تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفائے راشدینؓ کے زمانے (11-40AH بمطابق 632-661AD) میں، جب اسلام دین کی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھا تو اس میں اسلام کا عملی نظام صرف خدا کے ہی احکام کی اطاعت تھا۔

دین اور مذہب میں بنیادی فرق

عزیزانِ من! اس کے بعد دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ دین اور مذہب میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مذہب میں خدا کی پرستش کی جاتی ہے، خدا کی حاکمیت کا تصور نہیں ہوتا۔ خدا کی حاکمیت کا تصور ایک حاکم یا ایک اتھارٹی کے اعتبار پہ نہیں مانا جاتا بلکہ وہ معبود کے معنوں میں ہوتا ہے، جس کی پرستش کی جائے۔ عبادت کے معنی پرستش ہوتا ہے۔ مذہب میں صلوٰۃ نماز میں بدل گئی جو کہ صرف ایک مرئی سی چیز ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ نظامِ صلوٰۃ نہایت ضروری ہے جب خدا کی محکومیت کا یا خدا کی حاکمیت کا نظام قائم ہو گا تو اس کے اندر یہ اجتماعات ضروری ہونگے۔ انہیں اجتماعاتِ نماز کہتے ہیں لیکن یہ سب اس کی حاکمیت کا، اس کی حکومت کا، اس کی گورنمنٹ کے

کاروبار کا' ایک حصہ ہوگا۔ مذہب میں اللہ کے معنی ہو گئے ''وہ جس کی پرستش کی جائے یعنی پرستیدہ۔''

پرستش خدا کی اور حاکمیت ملوکیت کی

عزیزانِ من! یہ پرستیدہ اور پرستش وہی ایرانی الفاظ ہیں جو آپ کے ہاں بھی آ گئے۔ ان کا یہ سارا مفہوم بھی وہاں سے آیا تھا۔ پرستش اور پرستیدہ فارسی الفاظ ہیں۔ دنیائے مذہب میں پرستیدہ خدا ہے اور پرستش بمعنی پوجا پاٹ خدا کے لیے ہے۔ اب مذہب میں یہ ہو گیا کہ خدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو یعنی اطاعت تو جس کی جی چاہے کرتے چلے جاؤ' حکومت تو ملوکیت کی اختیار کرتے چلے جاؤ یعنی انسانوں کی حاکمیت تسلیم کرتے چلے جاؤ لیکن پرستش خدا کی کرو۔ مسلمان مطمئن ہو گیا کہ میں بتوں کی پرستش تو نہیں کرتا مگر محکومیت انسانوں کی اختیار کیے ہوئے ہے اور مطمئن ہے کہ میں شرک نہیں کرتا' مشرک نہیں ہوں کیونکہ میں بتوں کی پرستش نہیں کرتا۔ صلوٰۃ کا وہ نظام جو حکومتِ خداوندی کا تھا وہ صرف اس وقتی نماز میں بدل گیا جس میں صرف حرکات وسکنات ہوتی ہیں' رکوع اور سجود وغیرہ کی ساری بحث اس کے اوپر ہوتی ہے۔ آپ نے ٹی وی (ٹیلی ویژن) پہ بھی دیکھا ہے۔ اب انہوں نے وہ شکل دکھانی شروع کی ہوئی ہے کہ نماز اور وضو کیسے ہے اور بتاتے ہیں کہ اس میں یہ ہوتا ہے: دونوں پاؤں کے درمیان اتنا فاصلہ ہونا چاہیے' ہاتھ فلاں جگہ باندھنے چاہئیں' رکوع اس طرح کرنا چاہیے' سجدہ اس طرح کرنا چاہیے۔ اس سجدے سے' اس جھکنے سے' اس صلوٰۃ سے' اس عبادت سے' مقصود کیا ہے' یہ کہیں نہیں ذکر آتا' کیونکہ وہ تو یہ آئے گا کہ خالص خدا کے احکام کی محکومیت اور اطاعت ہو۔ مذہب میں مسجد صرف اس مقصد کے لیے رہ گئی کہ وہاں پانچ وقت کے لیے اکٹھے ہو کر نماز پڑھ لی جائے' یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ یہ جو داع اور تدعوا اور دعوت الی اللہ ہے' اس کا ترجمہ تو میں نے کہا ہے کہ ''پکارنا خدا کو'' کر لیا۔ خدا کو پکارنے کا ذہن میں کوئی مفہوم ہی نہیں آتا۔ مذہب میں یہ ایک مسئلہ بن گیا یعنی زندگی کا جو نظام تھا وہ مذہب میں پہنچ کر اب مسئلوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ کس چیز پہ بحث ہوتی ہے؟ خدا کو پکارنے پر۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اہلحدیث حضرات اور بریلوی حضرات کے درمیان بڑی شدید بحث ہوتی ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ وہ ''یا اللہ'' کے ساتھ ''یارسول اللہ'' بھی کہتے ہیں۔ ان کے ہاں یہ شرک ہوتا ہے' یارسول اللہ نہیں کہنا یعنی وہ جو سارا خالص اللہ کو' خالص خدا کو پکارنا تھا' اس میں پکارنے کے معنی ہو گئے کہ یہ یارسول اللہ نہیں کہہ سکتے۔

ہمارے ہاں کی بحثیں اور مناظرے

اب ہماری ساری بحثیں اس پر ہیں' اسی پر جنگ وجدل ہوتا ہے' اسی پر آپس میں اتنے سخت مناظرے ہوتے ہیں کہ ''یا اللہ'' یہ تو توحید ہو گئی اور اس کے ساتھ جو یارسول کہنا ہے' یہ شرک ہو گیا بلکہ وہ تو آ گیا: یا عبدالقادر جیلانی یعنی کسی اور کے ساتھ جو ''یا'' کہنا ہے

وہ شرک ہے۔اب یہ مسئلہ ہوگیا کہ یا صرف اللہ کے لیے کہا جا سکتا ہے یعنی ''یا'' کا لفظ کسی اور کے ساتھ کہا جائے تو شرک ہے لیکن اگر اس کی جگہ انسانوں کی محکومیت اور اطاعت اختیار کرنے سے جو شرک عظیم ہوگا اس کا تصور ہی ختم ہوگیا اور اب صرف خدا کو پکارنے کے معنی ہوگئے: یا اللہ کہنا' اور شرک ہوا کسی اور کے ساتھ ''یا'' کا لفظ استعمال کرنا۔ان اہل حدیث اور بریلوی حضرات کے ہاں بڑی شدت سے یہ بحثیں ہوتی ہیں۔آپ اخبارات میں دیکھیے اب تو یہ بحثیں لندن اور برمنگھم کی مسجدوں میں بھی جا پہنچی ہیں۔ سر پھٹول ہوتی ہے' لٹھ چلتے ہیں۔کس پہ؟ اس مسئلہ پہ کہ یہ رسول اللہ کے ساتھ ''یا'' کہتا ہے۔بس یہ رہ گئی سمٹ سمٹا کے بات۔

نظام صلوٰۃ کے قیام کی بجائے صرف نماز پڑھنا

قرآن نے اقیموا الصلوٰۃ کہا تھا۔کہا تھا کہ صلوٰۃ قائم کرو۔آپ دیکھیں گے کہ جہاں بھی **اقیموا الصلوٰۃ** آئے گا: صلوٰۃ قائم کرو' ان کے ہاں وہاں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ نماز قائم کرو۔اب تو ٹی وی (ٹیلی ویژن) پہ بھی اس کے بہت اشتہار آتے ہیں' اس کے اعلانات آتے ہیں' تو وہاں ہوتا ہے کہ نماز قائم کرو۔اب چونکہ کسی کی سمجھ میں بات آتی نہیں کہ نماز قائم کرو' کیا ہے؟ یہ جتنے بھی نماز پڑھنے جاتے ہیں ان سے پوچھو: کہاں گئے تھے؟ ہر ایک کہتا ہے: نماز پڑھنے گیا تھا۔پوچھو: کہاں سے آ رہے ہیں؟ کہتے ہیں: نماز پڑھ کر آ رہے ہیں۔کبھی کسی کو آپ نے یہ کہتے سنا کہ میں نماز قائم کر کے آ رہا ہوں۔یعنی تعلیم میں تو آتا ہے' اور ٹی وی (ٹیلی ویژن) پہ بھی آتا ہے مگر یہ صرف پڑھنا ہوتا ہے۔کبھی کسی نمازی سے آپ نے یہ سنا کہ وہ کہے کہ میں نماز قائم کر کے آیا ہوں یا نماز قائم کرنے جا رہا ہوں۔وہ نماز پڑھنے جاتا ہے' نماز پڑھ کے ہی آتا ہے۔اب وہ قائم کرنا' پڑھنے میں تبدیل ہوگیا۔لفظ تو قائم کرنا ترجمے میں بھی آ گیا اور ٹی وی (ٹیلی ویژن) پہ بھی' مگر وہ پڑھنے کے لیے گیا' پڑھ کے ہی آیا' اس لیے کہ یہاں پوچھنے سے الجھن پیدا ہوتی ہے کہ صاحب! وہ قائم کرنا کیا ہے۔قرآن نے ہر جگہ کہا ہے کہ ''صلوٰۃ'' قائم کرو۔ قرآن نے کہیں نماز پڑھنا کہا ہی نہیں۔

نماز کا تو لفظ ہی قرآن میں نہیں ہے۔ یہ لفظ تو ایران کا ہے' فارسی کا ہے۔اب وہ جو صلوٰۃ کے نظام کو قائم کرنا تھا' To establish the system وہ جو نظامِ خداوندی کا Establish (قائم) کرنا تھا جس میں اطاعت احکامِ خداوندی کی ہو' جب اس کا تصور پرستش میں آیا تو اس تصور کے ساتھ یہ ساری چیزیں جتنی بھی تھیں' یہ سب چیزیں' پوجا پاٹ کے اندر تبدیل ہوگئیں۔اب ''صلوٰۃ کا نظام'' قائم نہیں کیا جاتا' نماز پڑھی جاتی ہے' اب مسجد حکومتِ خداوندی کا مرکز نہیں رہا' اس کی سیکرٹریٹ کا مقصد' اس کی پارلیمنٹ کا مقصد نہیں ہوا' اس میں مقصد صرف نماز پڑھنا ہوگیا' جو داع ہے جو تدعوا' یدعوا الی اللہ ہے یا جو یدعوا ہے الی اللہ بھی نہیں' اس کے معنی ہوگئے: خدا کو پکارنا اور جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے: پکارنے پہ مسئلہ آ گیا کہ ''یا اللہ'' کہنا تو ٹھیک ہے' یہ توحید ہے مگر اللہ کے سوا کسی دوسرے کے ساتھ ''یا'' کہنا شرک ہوگیا۔یہ آ گیا شرک۔

اب یہاں بات کیا ہوئی؟ کہا ہے کہ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ یَدْعُوْہُ (72:19) جب اللہ کا ایک بندہ رسول اللہ یہ کہنے کے لیے کھڑا ہوا کہ حکومت صرف اللہ کی ہے تو کَادُوْا یَکُوْنُوْنَ عَلَیْہِ لِبَدًا (72:19) اس کے خلاف یہ مشرکین جو اس کو نہیں تسلیم کرتے تھے پل پڑے گویا اسے کچل ہی ڈالیں گے (22:72)۔ اب یہ قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ یَدْعُوْہُ (72:19) خدا کا بندہ اس دعوت کو لے کر اٹھا کہ حکومت صرف اللہ کی ہے تو ان کے ہاں اس کا ترجمہ ہو گیا کہ ''یا اللہ'' صرف اللہ کے لیے کہنا چاہیے اور وہاں اس آیت میں تھا کہ جب اس نے یہ کہا کہ حکومت صرف اللہ کی ہے تو یہ مخالفین ہجوم کر کے اس پر پل پڑے جس طرح اب یہ مناظروں میں ایک دوسرے کے اوپر پل پڑتے ہیں کہ اس نے ''یا رسول اللہ'' کیوں کہا۔ اس پر فساد ہوتا ہے دنگا ہوتا ہے لٹھم لٹھا ہوتے ہیں کہ صاحب! قرآن میں یہ بھی تو تھا کہ کَادُوْا یَکُوْنُوْنَ عَلَیْہِ لِبَدًا [1] (72:19)

خدا حاکم مطلق کی بجائے صرف پرستش تک رہ گیا

یہ کہتے ہیں کہ اسی طرح سے وہ بھی حضورﷺ کے ساتھ لٹھم لٹھا ہوتے تھے کہ یہ ''یا اللہ'' کیوں کہتا ہے یہ تمام آیات یہاں سمٹ کے آ گئیں۔ کس بنا پہ آئیں؟ اللہ کا تصور حاکمِ مطلق کی بجائے پرستش کرنے کی چیز رہ گیا۔ بس جونہی وہ تصور Object of Worship (مقصدِ پرستش) بنا نیچے کا سارا نظام بدل گیا سارا نظام دین سے مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اب اللہ نہ حاکم رہا نہ اس کی عبادت اس کی محکومیت رہی نہ اس کی صلوٰۃ وہ نظام رہا جس میں اطاعت صرف خدا کی کی جائے نہ مساجد اس کے نظامِ حکومت کے مراکز رہ گئیں نہ داع کرنا تھا جس کے معنی اس کے احکام کی طرف رجوع کرنا تھا رہا یہ خدا کو پکارنا ہو کر رہ گیا۔ یہ سارا کچھ خدا کا اللہ کا ایک تصور تھا۔ آپ دیکھیے کہ اس مغرب کے مفکر نے نے ٹھیک کہا تھا۔ ان کی بڑی گہری نظر ہوتی ہے۔ اب مسلمانوں کی ساری تاریخ ساری زندگی سارا تمدن تہذیب ثقافت معاشرت معیشت مذہب کے نقطۂ نگاہ سے ایک خدا کے تصور کے بدل جانے سے سب کچھ بدل گیا۔ اگر آپ نیچے سے ان چیزوں کی اصلاح کی طرف جاتے ہیں تو اصلاح کرنا تو بڑی بات ہے آپ قرآن کی آیات کا جو مفہوم بیان کرتے ہیں تو اس کے اوپر آپ کی مخالفت ہوتی ہے کفر کے فتوے لگ جاتے ہیں۔ وہ بھی سچے ہیں کہ اگر خدا کا تصور پرستیدہ کا رہے گا جس کی پرستش کی جائے گی تو نیچے کے یہ جتنے مفہوم میں نے ابھی عرض کیے ہیں وہ اس میں فٹ ان (موزوں: Fit-in) نہیں ہونگے یہ بات ان میں سے اکثر کی سمجھ میں بھی نہیں آئے گی۔ وہ ٹھیک بات ہے: یہی پڑھا گیا ہے یہی پڑھایا گیا یہی ہزار برس سے ان کو کتابوں میں لکھا ہوا مل رہا ہے۔ قرآن کی تو ثواب کی خاطر تلاوت ہوتی ہے مردوں کو بخشانے کی خاطر اس کو پڑھا جاتا ہے عملی زندگی

---

[1] یہ لوگ مخالفتوں کے ہجوم کے ساتھ اس پر یوں امڈ پڑے گویا اسے کچل ہی ڈالیں گے (22:72)۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

میں اس کا واسطہ ہی کچھ نہیں ہے۔

غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق مولانا اسلم جیراج پوریؒ اور مولانا مودودیؒ کی بحث

ایک دفعہ مولانا اسلم [1] جیراج پوری علیہ الرحمۃ کی غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق بحث ہوئی کہ یہ قرآن کی رو سے جائز نہیں ہے۔ مرحوم سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ساتھ یہ بحث تھی۔ قرآنی آدمی تھے' قرآنی دلائل انہوں نے دیئے اور اس سے ثابت کیا کہ یہ غلط ہے۔ مودودی [2] مرحوم (1903-1978) نے آخر میں یہ لکھا کہ ان کی غلطی یہ ہے کہ یہ صرف قرآن سے احکام مستنبط کرتے ہیں۔ ''غلطی یہ ہے''! اور کہا کہ یہ خبطی ہیں' الٹی کھوپڑی کے لوگ ہیں۔ کیا جرم ہے؟ کہ جی! قرآن سے احکام مستنبط کرتا ہے۔ اس سے آگے چلے تو ان کے امین احسن اصلاحی نے میرے متعلق کہا: مرتد ہے کہ قرآن سے صرف احکام کو مستنبط کرتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ جب اسلام کا تصور وہ ٹھہرا تو یہ کچھ تو ہوگا۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ وہی اللہ کا ایک تصور ہے۔ جرم ہمارا یہ تھا کہ ہم نے خدا کا وہ تصور قائم کیا جو قرآن قائم کرتا ہے۔ خدا کا یہ تصور اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ [3] (6:58) ہے۔

فرقوں کے نام پر مساجد کا وجود

عزیزانِ من! اور آگے بڑھیے۔ تو اس نے کہا تھا کہ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ [4] (72:18)۔ چلیے صاحب! ان کی مسجدیں ہی لے لیجیے۔ ان میں یہ تو ہو کہ اللہ کی مسجد ہو مگر آپ دیکھیے کہ یہاں سے وہاں تک مسجدوں کے باہر لکھا ہوگا: مسجدِ غوثیہ نظامیہ' مسجد رضویہ' آپ سارے شہر میں جایئے' کسی مسجد کے باہر آپ کو یہ لکھا ہوا نہیں ملے گا کہ یہ اللہ کی مسجد ہے۔ ذہن میں زور دیجیے' اگر میں کہیں غلطی

---

[1] علامہ اسلم جیراجپوری (1879-1955) حوالہ: منصور سرمدی: رفتید' ولے نہ از دل ما (علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری)' طلوعِ اسلام مارچ 2006ء' ص ص۔ 5 تا 9۔

[2] تاریخ پیدائش 25 ستمبر 1903ء' جائے پیدائش حیدر آباد دکن' ولادت اورنگ آباد' (بھارت) امریکا کے ہسپتال میں پاکستان کے وقت کے مطابق شام پونے چھ بجے 22 ستمبر 1979ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔ تدفین لاہور میں ہوئی' بحوالہ روزنامہ جسارت کراچی' مجریہ 25 ستمبر 2003ء مولانا مودودیؒ پر خصوصی اشاعت)

[3] حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[4] مساجد وہ مراکز ہیں جہاں بیٹھ کر قوانین خداوندی کے پروگرام اور ان کی عملی تنفیذ طے ہوتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

کرتا ہوں تو بتایئے کہ کسی مسجد کے باہر یہ لکھا ہوا ہے۔ وہاں تو آپ کو غوثیہ' رضویہ ہی لکھا ہوا نظر آئے گا: مسجدِ اہلحدیث' مسجد حنفیہ' مسجد حنفیہ رضویہ' مسجد حنفیہ رضویہ غوثیہ۔ جب آپ ایک خدا کو چھوڑیں گے تو پھر اس کے ساتھ یہ سارے چلے آئیں گے۔ شرک میں یہی تو موج ہوتی ہے کہ ہزاروں خدا بن جاتے ہیں مگر صحیح تصورِ اسلام میں تو ایک سے دوسرا نہیں بن سکتا۔ یہ کچھ چلا ہوا ہے' مسجدوں کے باہر یہ کچھ تو ہوگا اور پھر اس پر آپ دیکھتے ہیں کہ روز لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں' پولیس آ جاتی ہے' تالے پڑ جاتے ہیں۔ کس بات کے اوپر؟ کہ جی! یہ تو صرف حنفیہ کی مسجد ہے' اہلحدیث یہاں نماز نہیں پڑھ سکتا۔ اور کہا یہ جائے گا کہ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ (72:18) معاف رکھیے گا' اس بیچارے اللہ کے حصے میں تو اب وہ خانہ بھی نہیں آتا: کوئی مسجد نہیں ہے جس پہ یہ ہو کہ یہ اللہ کی مسجد ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے!

یہ مراکز صرف حکومتِ خداوندی کے لیے مختص ہونے چاہئیں

عزیزانِ من! اب تو یہ باتیں کرنا بھی جرم ہو گیا ہے۔ اب تو ان حضرات کے یہ عقائد آہستہ آہستہ قوانین بنتے چلے جائیں گے۔ ہاں' تو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا (72:18) یہ مراکزِ حکومت خداوندی صرف اطاعتِ خداوندی کے لیے مختص اور مخصوص ہیں۔ ان کے ساتھ کسی اور کی اطاعت کا تصور تک بھی ذہن میں آئے گا تو یہ شرک ہو جائے گا۔ اور کہا کہ یہ اتنا بڑا انقلابی دعویٰ ہے کہ اس دعوت کو لے کر اٹھنے والے کے لیے کہا کہ وَاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ یَدْعُوْہُ (72:19) اور جب خدا کا ایک بندہ (رسول اللہؐ) اس دعوت کو لے کر اٹھا۔ یہاں صرف ایک لفظ کہا ہے کہ یہ اللہ کا بندہ: عبداللہ۔ کیا بات لے کے اٹھا ہے؟ اس کے جواب میں یہاں ''قام'' کا لفظ آیا ہے۔ آپ سوچیے کہ پھر کیا ہوا جو یہ اٹھا۔ ان کے مطابق یہ نماز میں آ کے صرف قیام ہو گیا۔ ٹھیک ہے قیام تو ہے لیکن اِن کے ہاں ان آیات کے معنی یہ ہو گئے کہ جب یہ اللہ کا بندہ نماز کے لیے ''قیام'' میں اٹھا تو ''قیام'' میں یہ اس کے اوپر پل پڑے' رکوع میں چلا گیا تو پھر کچھ نہیں کہا کیونکہ یہاں لفظ قام آیا ہے۔ عزیزانِ من! کتنا بڑا انقلابی قدم ہے جب یہ اس دعوت کو لے کر اٹھا کہ اطاعت و محکومیت صرف خدا کی ہے۔ اٹھا: کیا لفظ ہے قام کا یہاں! ہر زبان میں اس مقصد کے لیے یہ قام کا لفظ آتا ہے' کسی ایک انقلاب کے لیے' جو اٹھنا ہوتا ہے وہ قام ہے۔ اس کے لیے اقبالؒ (1877-1938) کی رباعی تو کسی کو یاد نہیں ہے۔ یہ اس دَور کا ملا کیا جانے! قیامت ہا کہ در قد قامت اوست۔ صلوٰۃ کی قد قامت کے اعلان میں جو قیامت پوشیدہ ہے اس کو یہ کیا جانے! قد قامت الصلوٰۃ' قامت الصلوٰۃ۔ قیامت کا لفظ ''قام'' سے ہی تو ہے۔ ارے اس کے معنی انقلاب کے ہیں۔ جب وہ اٹھا' کیا الفاظ ہیں قرآن کے! پھر یہ دیکھیے کہ جب یہ اللہ کا بندہ صرف خدا کی حکومت کی دعوت لے کر اٹھا ہے اور اس کے لیے خدا اس کو اپنا عبد کہتا ہے کہ کہیں اس کی حکومت نہ سمجھ لینا کہ یہ اپنی حکومت کی دعوت دینے کے لیے اٹھا ہے۔ ''عبد'' کا لفظ صاف کہہ دیا

ہے۔ یہ قرآن ہے۔

ہر انسانی حکومت کے بالمقابل قرآنی حکومت

عزیزانِ من! یہ قرآن کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔ ایک ایک لفظ میں وہ اپنی ساری حقیقت بیان کر دیتا ہے۔ کہاں لایا ہے عبد کا لفظ! کہ کہیں یہ بات نہ سمجھ میں آ جائے یا یہ نہ اس کے ذہن میں آ جائے معاذ اللہ یا تم یہ بات نہ سمجھ لو کہ یہ اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوا ہے۔ قام عبداللہ: کاہے کے لیے اٹھا ہے؟ کہا: یَدْعُوْہُ (72:19) دعوتِ قوانینِ خداوندی کے لیے۔ منصب رسالت اس طرح سے پاکیزہ، منزہ شکل کے اندر یعنی مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ (72:19) اطاعت کو اسی کے الدین کے لیے مختص کر دو۔ یہاں آیا ہے: قَامَ عَبْدُ اللّٰہِ (72:19) خدا کا ایک بندہ اس دعوت کو لے کر اٹھا۔ سوال یہ ہے کہ کاہے کے لیے؟ کہا: یدعوہ۔ تو یہ انقلابی آواز تو ساری دنیا کے لیے اعلانِ بغاوت تھا، اعلانِ جنگ تھا۔ پھر کیا ہوا؟ کہا کہ کَادُوْا یَکُوْنُوْنَ عَلَیْہِ لِبَدًا (72:19) پل پڑیں گے ایسے جیسے اس کی تکہ بوٹی کر دیں گے۔ ٹھیک ہے ان کی ساری زندگی کے جتنے بھی پروگرام ہیں وہ اس ایک آواز میں ختم ہو جاتے تھے کہ سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے۔ کہا کہ وہ اس پر پل پڑیں گے۔ پھر اسے کہا کہ ان کے ان حملوں سے، ان کی ستیزہ کاریوں سے، دبنے کی کوئی بات نہیں ہے، استقامت کی بات ہے: قل (72:20) ان سے کہہ دو۔ یاد رکھیے! وہ تو یہ کہہ کے لپٹ پڑتے ہیں۔ یہاں کہا کہ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ (72:20) ان سے کہہ دو کہ میں صرف اپنے رب کی حکومت کی دعوت دینے کے لیے کھڑا ہوا ہوں اور وَلَآ اُشْرِکُ بِہٖٓ اَحَدًا (72:20) اس کے ساتھ کسی اور کو میں شریک نہیں کر سکتا۔

عزیزانِ من! دیکھا ان آیتوں کے اندر کتنی بڑی قیامتیں پوشیدہ ہیں اور ان کا ترجمہ اب صرف یہ رہ گیا کہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں، پرستش اسی کی کرنی چاہیے، نماز اس کے لیے ہی پڑھنی چاہیے، اس کے سوا کسی اور کے لیے نہیں کرنی چاہیے۔ اب یہ جو پل پڑتے ہیں، یہ وہ ہیں جو ''یارسول اللہ'' کہنے والوں کے خلاف یا جو ''یااللہ'' کہنے والے حملہ کرنے آ جاتے ہیں ان کا مطلب یہ ہے پولیس والے آ جاتے ہیں۔ اب ان آیتوں کا یہ مفہوم رہ گیا۔

میرے پاس کسی کو نفع نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں

عزیزانِ من! اپنی ذات کے متعلق یہاں عبد کہا تھا پھر اس کے لیے تردید کی کہ کہیں اس میں اس کی ذاتی حکومت نہ سمجھ لینا۔ کہا کہ قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (72:21) میں تمہارے لیے کسی قسم کے نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ مملکت کا سب سے بڑا جسے آپ اتنی بڑی سلطنت کا ہیڈ آف دی سٹیٹ کہتے ہیں، وہ سربراہِ مملکت ہے اور عام الفاظ میں کہیے تو یہ وہ ہے جسے آپ

''ڈکٹیٹر'' کہتے ہیں' یہ رسول ہے' سربراہِ مملکت ہے' کہتا ہے: اس مملکت کی جو میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں' حکومت قائم کر رہا ہوں' میں تمہیں کسی قسم کا نفع نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اللہ اکبر! سربراہِ مملکت ہے تو کسی کو ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتا کیونکہ اس مملکت کے قیام کے تو معنی خدا کے احکام کی تنفیذ ہے۔ میرا کیا ہے جو میں تمہیں یہ نفع نقصان دونگا۔

عزیزانِ من! یہ ہے حکومتِ خداوندی' یہ ہے اسلامی مملکت کا آئین کہ سربراہِ مملکت کو بھی یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی کو کسی قسم کا خدا کے قوانین کے خلاف نقصان یا فائدہ پہنچا سکے۔ کہا کہ قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰہِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا (72:22) ان سے کہہ دو کہ میں بھی اگر کسی قسم کی یہ چیز اپنے لیے اختیار کرلوں تو خدا کے عذاب سے پناہ دینے والا مجھے کوئی نہیں ملے گا' مجھے کوئی پناہ نہیں دے سکے گا۔ میرا کیا ''جرم'' ہے کہ میں یہ کہوں کہ مجھے دستورِ خداوندی میں کچھ اختیار حاصل ہے۔ عزیزانِ من! کسی انسان کو دوسرے انسان کے اوپر کوئی اختیار ہی حاصل نہیں ہوتا۔ کہا کہ میں اگر یہ چیز تصور بھی کرلوں یا ایسا کروں تو خدا کے عذاب سے مجھے کوئی پناہ نہیں دے سکے گا: وَلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا (72:22) اس کو چھوڑوں گا تو دنیا میں کسی جگہ مجھے پناہ نہیں مل سکے گی۔ یہ کچھ رسول کہہ رہا ہے۔ کیوں کہہ رہا ہے؟ عبد ہے' غلام اپنے آقا کو چھوڑتا تھا تو پھر اسے کہیں پناہ نہیں ملتی تھی اور جب آقا ہی ہزاروں بنا رکھے ہوں تو پھر ہر جگہ پناہ ملتی ہے: اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِسٰلٰتِہٖ (72:23) میرا کام یہ ہے کہ میں قوانین خداوندی کو جو اس نے مجھے دیے ہیں تم تک پہنچا دوں۔ یہ بات اگلی آیت میں بھی چلی آ رہی ہے۔

عزیزانِ من! وقت ختم ہوا۔ ہم سورۃ الجن کی آیت 22 تک آ گئے' 23 سے آئندہ ہم لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀.....❀❀❀.....❀

ذہن جو قرآن بناتا ہے

خواجہ ازہر عباس قرآنی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت ہیں سال ہا سال سے ان کے علمی و قرآنی مضامین طلوع اسلام میں طبع ہو رہے ہیں جو بہت پسند کئے جاتے ہیں۔ عرصہ سے قرآنی احباب کا اصرار تھا کہ ان کے یہ قیمتی مضامین ایک کتابی شکل میں طبع کر دیے جائیں تا کہ آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ بنے رہیں' ادارہ اور خواجہ صاحب کی اجازت سے ان مضامین کو شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ صفحات 504 ہیں۔ رعایتی قیمت صرف 250 روپے بمع ڈاک خرچ اور طلوع اسلام ٹرسٹ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

دین میں انفرادی پرستش کی اجازت نہیں ہے

ہر مذہب میں اللہ تعالیٰ کی پرستش کے لئے کچھ بندھے ٹکے طور طریقے مقرر کر دیئے جاتے ہیں اور ان طریقوں اور رسوم کی ادائیگی سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے۔ یہ طور طریقے عموماً کچھ اعمال و رسومات پر مشتمل ہوتے ہیں ان اعمال و رسومات کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ رسومات کسی جگہ اور کسی بھی معاشرے میں ادا ہوسکتی ہیں۔ ان رسومات کی ادائیگی سے نتائج و ثمرات برآمد ہونے کی توقع بھی نہیں کی جاتی بلکہ عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ ان رسومات کا اجر و معاوضہ اگلی زندگی میں حاصل ہوگا اور ان رسومات کی ادائیگی سے اگلی زندگی اچھی ہو جائے گی۔ ان اعمال و رسومات کے لئے ایک جامع لفظ پرستش کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کے ذیل میں ہر طرح کی رسومات آجاتی ہیں۔ مختصر بات تو صرف یہ ہے کہ مذاہب کا کلی طور پر دارومدار صرف پرستش پر ہوتا ہے۔ جس کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

نزولِ قرآنِ کریم کے وقت ہر طرف مذہب کا دور دورہ تھا اور عبادت کا تصور صرف پرستش تک محدود سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اس نے مذہب کا تصور بدل کر رکھ دیا۔ ہر انسان اپنے زمانی و مکانی حالات میں گھرا ہوتا ہے۔ اپنے اردگرد کے حالات اور اس دور کے فکر سے بلند ہوکر سوچنا انسان کے بس سے باہر ہے۔ قرآن کریم چونکہ وحی الٰہی ہے اس لئے اس نے اپنے دور سے بلند ہوکر مذہب کا تصور بدل دیا اس نے دین کا وہ تصور پیش کیا کہ جس کی رو سے پرستش کے تصور کو جڑ اور بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دیا۔ قرآن کریم کے نزدیک ہر حکم کی اطاعت عبادت ہے اور ہر عبادت خود حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک عبادت صرف چند رسومات کی ادائیگی اور پرستش تک محدود نہیں ہوتی بلکہ عبادت ساری زندگی پر محیط ہوتی ہے۔ اس عبادت کے لئے اس نظام پر عمل کرنا ضروری ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے اور اس نظام کی اطاعت ہی عبادت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيـنَ آمَـنُـواْ أَطِيعُواْ اللّـهَ وَأَطِيعُواْ الـرَّسُـولَ وَأُوْلِـي الأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَـيْءٍ فَـرُدُّوهُ إِلَـى الـلّـهِ وَالـرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ (4:59)-

اے ایمان والو! خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اور جو تم میں سے صاحبانِ حکومت ہوں ان کی اطاعت کرو، اور اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو اگر تم خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو، تو اس امر میں خدا اور رسول کی طرف رجوع کرو۔

اس آیت نے واضح کر دیا کہ روزِ آخرت پر ایمان لانے کا لازمی تقاضہ اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اپنے ہر تنازع اور اپنے ہر اختلاف کو اللہ و رسول کی طرف لوٹایا کرو ظاہر ہے کہ اللہ و رسول کے حکم کو جاری کر کے ان کو عملی شکل دیا کرو۔ یہ آیۂ کریمہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے ایک حجتِ قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے کہ اللہ و روز آخرت پر ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اسلامی نظام کے ذریعے قرآنی احکامات جاری نہ ہو رہے ہوں۔ اسلامی نظام کے قیام کے بعد ہی اللہ و روزِ آخرت پر پوری طرح ایمان مکمل ہوتا ہے۔

صدر اول میں یہی صورت تھی۔ دین اپنی اصل شکل میں قائم تھا اور اس نظام میں اللہ اور رسول کے احکامات جاری ہوتے تھے۔ ہماری بدقسمتی کہ وہ نظام درہم برہم ہوگیا اور دین کا تصور نظروں سے بالکل اوجھل ہوگیا۔ لیکن اب کچھ تو زمانہ کے تقاضوں کی وجہ سے اور کچھ تحریک طلوع اسلام کی وجہ سے ''دین'' کا تصور پھر ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔ صدرِ اول کے بعد سے دین کا تصور کسی شخص یا کسی تحریک نے کبھی پیش نہیں کیا تھا۔ تحریک طلوع اسلام نے اس تصور کو اس قدر بلند آواز سے اٹھایا کہ اور تو اور، ہماری مذہبی قیادت بھی اس سے متاثر ہوئی ہے، اب ہمارے علماء کرام بھی اسلام کا نعرہ بلند کرتے دکھائی دے رہے ہیں، حالانکہ دین کا یہ تصور ان کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہماری اسی پیشوائیت نے قیام پاکستان کی ڈٹ کے مخالفت کی تھی۔ کیونکہ ان کے نزدیک اسلامی نظام ضروری نہیں تھا۔ ہماری آج کی پیشوائیت ان حضرات کی ہی جانشین ہے۔ ہمارے درسِ نظامی میں جو کتب تفاسیر و احادیث کی پڑھائی جاتی ہیں وہ سب مذہب کے نقطۂ نگاہ سے تحریر کردہ ہیں۔ ان میں دین کا تصور بالکل مفقود ہے لیکن چونکہ تحریک طلوع اسلام کی وجہ سے اب علماء کرام مجبور ہو گئے ہیں کہ دین کی طرف آئیں اس لئے وہ دین کا نعرہ تو بلند کرتے ہیں لیکن انکے سامنے دین کا وہی تصور ہے جو تصور مذہب کا ہوتا ہے۔ وہ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ایک طرف وہ دین اور اسلامی نظام کا نعرہ بلند کرتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ انفرادی پرستش کے بھی قائل اور اس پر عامل ہیں۔ وہ عبادات اور معاملات کی تقسیم کرتے ہیں اور عبادات میں پھر وہ صرف چند رسوم کو شامل کرتے ہیں اور معاملات کی اطاعت کو عبادت الٰہی کے زمرہ میں شامل نہیں کرتے جبکہ دین کا خالص قرآنی تصور یہ ہے کہ عبادات و معاملات میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ ہر معاملہ کی اطاعت ہی

عبادتِ خداوندی ہے۔ ہر دنیاوی کام جو وحی کی رو سے طے کر دیا جائے' اس کی اطاعت عبادت الٰہی ہو جاتی ہے لیکن یہ تصور صرف تحریک طلوع اسلام کا پیش کردہ ہے' ہمارے علماء کرام انفرادی پرستش کو کبھی بھی چھوڑنے کو تیار نہیں ہو سکتے۔ طلوع اسلام کے اس عقیدہ کے ثبوت میں کہ عبادات ومعاملات کی تقسیم غیر قرآنی ہے اور ہر قرآنی حکم کی اطاعت عبادت ہے۔ مندرجہ ذیل آیات پیش خدمتِ عالی کی جاتی ہیں۔

(1) الَّذِيْنَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (22:41)-

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں روئے زمین پر قابو دے دیں تو یہ لوگ نماز ادا کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور ہر معاملہ کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔

آیہ کریمہ میں اقامتِ صلوٰۃ' ایتائے زکوٰۃ' امر بالمعروف نہی عن المنکر اور ہر معاملہ کا فیصلہ قانون خداوندی کے مطابق طے کرنا' ان پانچ امور کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہمارے علماء کرام ان پانچ امور میں سے پہلے دو امور' یعنی اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کو عبادت خداوندی شمار کرتے ہیں' جبکہ امر بالمعروف نہی عن المنکر اور تمام امور کے فیصلے وحی کے مطابق طے کرنے کو عبادت میں شمار نہیں کرتے لیکن قرآنِ کریم نے ان پانچوں امور کو ایک ہی صف میں رکھا ہے اور ان پانچوں امور کی سرانجام دہی کے لئے تمکن فی الارض (اقتدار) کو Pre-requistie قرار دیا ہے۔ اس لئے اس آیت سے واضح ہے کہ یہ پانچوں امور عبادت خداوندی میں شامل ہیں۔

(2) الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيْمُونَ الصَّلاَةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيْعُونَ اللّهَ وَرَسُولَهُ أُوْلَـئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّهُ (9:71)-

ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں ان میں سے بعض کے بعض رفیق ہیں لوگوں کو اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور بُرے کام سے روکتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا عنقریب رحم کرے گا۔

یہاں پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے برابر درجہ دیا گیا ہے۔ اس آیۂ کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ جملہ امور میں اللہ ورسول کی اطاعت کا وہی مقام ہے جو اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا مقام ہے' لہٰذا جملہ امور کی اطاعت عبادت الٰہی ہے۔ قرآنِ کریم اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ اور جملہ امور میں اطاعتِ اللہ و

رسول میں کوئی فرق نہیں کرتا۔

(3) وَالَّـذِيـنَ اسْتَـجَـابُـوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (42:38)-

اور جو اپنے پروردگار کا حکم مانتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور ان کے کل کام مشوروں سے ہوتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اپنے پروردگار کے حکم کو ماننا' اقامتِ صلوٰۃ' آپس میں باہمی مشورہ کرنا' اور انفاق یہ چاروں امور ایک ساتھ ایک ہی زمرہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اگر اقامتِ صلوٰۃ عبادت ہے تو ظاہر ہے کہ یہ تین باقی امور بھی عبادت ہیں۔ صلوٰۃ کو عبادت قرار دینا اور باہمی مشورہ کرنے کو عبادت قرار نہ دینا' اس آیت کے خلاف استنباط کرنا ہے۔ اس آیت میں بھی اپنے پروردگار کے ہر حکم کو ماننا عبادت ہی قرار دیا گیا ہے اور ہر حکم کی اطاعت عبادت کی قرار دی گئی ہے۔

(4) اعْدِلُواْ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَاتَّقُواْ اللّهَ إِنَّ اللّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (5:8)-

تم ہر حال میں عدل کرو کہ یہ تقویٰ سے بہت قریب ہے اور خدا سے ڈرو کیونکہ جو کچھ تم کرتے' خدا اسے جانتا ہے۔

یہاں عدل کرنے کو تقویٰ سے قریب قرار دیا گیا ہے جو کہ عبادت کی آخری شکل شمار کی جاتی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ عدل کرنا' تقویٰ اور عبادت میں شامل ہے۔

(5) وَقُولُواْ لِلنَّاسِ حُسْناً وَأَقِيمُواْ الصَّلاَةَ وَآتُواْ الزَّكَاةَ (2:83)-

لوگوں کے ساتھ نرمی سے باتیں کرو' اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو۔

یہاں لوگوں کے ساتھ نرمی سے باتیں کرنا' اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے ہم پلہ قرار دیا گیا ہے اور تینوں امور ایک ہی درجہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اگر اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ عبادت خداوندی ہے تو یقیناً لوگوں کے ساتھ نرمی سے گفتگو کرنا بھی عبادتِ خداوندی میں شامل ہے۔

(6) أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّواْ أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُواْ الصَّلاَةَ وَآتُواْ الزَّكَاةَ (4:77)-

اے نبی کیا تم نے ان لوگوں پر نظر نہیں کی جن کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو۔

جن لوگوں کو جہاد کی شدید آرزو تھی یہاں ان سے کہا گیا ہے کہ کچھ صبر کرو اور نماز پڑھتے رہو' اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ اس آیہ نے واضح کر دیا کہ قرآن کریم نے جن مومنوں کو حکم دیا تھا کہ ابھی جہاد کا وقت نہیں آیا ہے' اس لئے ابھی جہاد سے رکے رہو' یہ حکم اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے ساتھ دیا گیا ہے اور اس کی اطاعت اسی طرح عبادت خداوندی ہے

جس طرح اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ عبادت ہیں۔

(7) وَأَقِيمُواْ الصَّلاَةَ وَآتُواْ الزَّكَاةَ وَمَا تُقَدِّمُواْ لأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللّهِ (2:110)-

اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے جاؤ اور جو کچھ بھلائی اپنے لئے پہلے بھیج دو گے اس کو موجود پاؤ گے اور جو کچھ تم کرتے ہو' اسے خدا ضرور دیکھ رہا ہے۔

یہاں پھر صلوٰۃ اور زکوٰۃ اور بھلائی کے کاموں کو ایک جیسا شمار کر کے' تینوں کو عبادت شمار کیا گیا ہے۔ بھلائی کے کام کرنا اسی طرح عبادت ہیں جس طرح صلوٰۃ و زکوٰۃ + آیۂ کریمہ کے آخری حصہ میں جو فرمایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس آیت میں اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ نیکی کے کاموں کو بھی شامل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ تمہارے نیکی کے کاموں کو بھی دیکھ رہا ہے۔ آیت کریمہ کے آخری حصہ نے مزید اس بات کی توثیق کر دی کہ جس طرح اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ عبادت ہے' اسی طرح نیکی کے کام کرنا بھی عبادت ہے۔

(8) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُواْ وَعَمِلُواْ الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُواْ الصَّلاَةَ وَآتَوُاْ الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ (2:277)-

جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کئے اور پابندی سے نماز پڑھی اور زکوٰۃ دی ان کے لئے اجر و (ثواب) ان کے پروردگار کے پاس ہے اور نہ تو ان پر کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ ہی وہ رنجیدہ ہوں گے۔

اس آیہ کریمہ میں پھر اعمال صالحہ کو اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ سارے اعمال صالحہ کی سرانجام دہی' عبادت خداوندی بجا لانے کے برابر ہے۔ ایمان لانا' اعمال صالحہ' اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا مجموعی نتیجہ ماجور عنداللہ ہونا اور خوف وحزن سے محفوظ ہونا ہے' ان تمام آیات میں آپ عبادت اور معاملات کو الگ الگ کر ہی نہیں سکتے۔ ماجور عنداللہ ہونا' اور خوف وحزن سے محفوظ ومصئون ہونا' چاروں امور کا مجموعی نتیجہ ہے۔ ان چاروں امور میں تفریق نہیں کی جاسکتی۔

(9) الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلاَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (8:3)-

جو نماز ادا کرتے ہیں اور جو ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اس آیہ کریمہ میں دوسروں پر اپنی کمائی کو خرچ کرنے کو صلوٰۃ کے برابر عبادت قرار دیا گیا ہے۔

(10) فَأَقِيمُوا الصَّلاَةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا

بِاللّٰہِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (22:78)-

نماز پڑھا کرو' زکوٰۃ دیتے رہو' اور خدا ہی (کے احکام) کو مضبوط پکڑو وہی تمہارا سرپرست ہے تو کیا اچھا سرپرست ہے اور کیا اچھا مددگار۔

یہاں اعتصام باللہ سے مراد مفسرین نے قرآن کریم کے احکامات پر عمل کرنے کو قرار دیا ہے۔ قرآن کریم کے تمام احکامات پر عمل کرنا' اور ان کا اتباع کرنا' اسی طرح عبادت خداوندی ہے جس طرح اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ عبادت خداوندی ہے۔

(11) وَأَقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (24:56)-

اور نماز پڑھا کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور رسول کی اطاعت کرو' تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

یہاں پھر اطاعتِ رسول کو اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اول کی دو چیزیں' یعنی اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ تو عبادت خداوندی قرار دی جائیں اور اطاعتِ رسول کو عبادت خداوندی میں شامل نہ کیا جائے۔ سابقہ آیت نمبر 22:78 میں قرآن کے احکامات کی اطاعت کو اور موجودہ آیت کریمہ میں رسول کی اطاعت کو اسی طرح عبادت خداوندی ٹھہرایا گیا ہے۔ جس طرح اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ عبادت خداوندی ہیں اور ان تینوں احکامات پر عمل کرنے کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں پر رحم کیا جائے۔

(12) اتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ (29:45)-

(اے رسول) جو کتاب تمہارے پر نازل کی گئی ہے اس کا اتباع کرو (تلاوت کرو) اور نماز پڑھو۔

اس آیت کریمہ سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کا اتباع اور اقامتِ صلوٰۃ دونوں ایک ہی چیز ہے اور دونوں عبادت خداوندی ہیں۔

(13) مُنِيْبِيْنَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوا دِيْنَهُمْ وَكَانُوا شِيَعاً (32-30:31)-

اسی کی طرف رجوع کر کے' اسی سے ڈرتے رہو' نماز پڑھو اور مشرکین میں سے نہ ہو جانا کہ جنہوں نے اپنے دین میں فرقے بنا لئے اور مختلف فرقے ہو گئے۔

یہاں انابتِ الی اللہ' تقویٰ اقامتِ صلوٰۃ اور فرقہ بندی سے اجتناب کو عبادتِ خداوندی قرار دیا گیا ہے جس طرح اقامتِ صلوٰۃ عبادتِ الٰہی ہے' اسی طرح فرقہ بندی سے اجتناب عبادتِ الٰہی ہے۔

(14) الَّذِيْنَ يُقِيْمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُم

بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ(31:4)-

جو نماز ادا کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہی لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

یہاں آخرت پر یقین لانے کو عبادت قرار دیا گیا ہے۔

(15) يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَى مَا أَصَابَكَ (31:17)-

اے بیٹے نماز پڑھا کرو' معروف کا حکم دیا کرو' برے کاموں سے روکو اور جو مصیبت تم پر پڑے اس پر صبر کرو۔

اس آیہ کریمہ کے مطابق اقامتِ صلوٰۃ' امر بالمعروف نہی عن المنکر اور مصائب پر صبر کرنا' یکساں عبادتِ خداوندی ہے۔

اس طرح کی اور بھی آیات کریمات قرآن کریم میں موجود ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کی طرح دیگر احکامات قرآن کا اتباع کرنا بھی عبادت خداوندی ہے۔ یہاں تک ان آیات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآنِ کریم کے ہر حکم کی اطاعت عبادتِ خداوندی ہے اور عبادت خداوندی صرف پرستش تک محدود نہیں ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ قرآنی احکامات کی اطاعت اسلامی حکومت کے ذریعے اور اس کے توسط سے عبادت کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ بالفرض اگر ان احکامات میں سے کوئی حکم ہندوستان کی حکومت جاری کر دے تو اس کی اطاعت عبادت نہیں ہو گی۔ اگر ہندوستان کی حکومت یا امریکہ کی حکومت' شراب نوشی کو ممنوع قرار دے دے اور وہاں کے مسلمان' اس حکومت کے حکم پر عمل کرتے ہوئے شراب نوشی بند کر دیں' تو ان کا شراب نوشی سے اجتناب عبادت خداوندی شمار نہیں ہوسکتا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ ہر ملک میں ایک حکومت ہوتی ہے جس کے احکامات وقوانین کی فرمانبرداری کرنا' ہر شہری کا فرض ہوتا ہے' اس (Secular) حکومت کے احکامات کی فرمانبرداری کرنے سے کوئی ثواب حاصل نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی خلاف ورزی سے کوئی گناہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ دوسروں کے گھروں میں بلا اجازت داخل نہ ہو۔ ہر حکومت میں اس حکم پر عمل ہوتا ہے۔ لیکن اس حکم پر عمل کرنے سے کوئی ثواب نہیں ملتا۔ ہاں جب اسلامی حکومت یہ حکم جاری کرتی ہے تو اس کی اطاعت سے ہر شہری کو ثواب حاصل ہوگا اور اس حکم کی فرمانبرداری عبادت شمار ہوگی اور جو شہری اس کی خلاف ورزی کرے گا' اس کو گناہ ہوگا' اس طرح اسلامی حکومت کا ہر شہری' صبح سے رات تک اور رات سے صبح تک' عبادت خداوندی میں مصروف ہوتا ہے اور ان کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے سے از خود اجتناب کرتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ ہر طرح کی قوت

فراہم رکھو تا کہ تم اس سے اپنے دشمن اور اللہ کے دشمن کو ڈراتے رہو۔ عام غیر اسلامی (Secular) حکومتوں میں بھی قوت فراہم ہوتی ہے لیکن اسلامی حکومت میں قوت فراہم کرنے سے نفس انسانی پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں یعنی ثواب حاصل ہوتا ہے' اس طرح ہر فوجی ہر وقت مزید قوت حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہے گا۔ لیکن اگر ہم عبادت کو صرف پرستش کے زمرہ تک محدود رکھتے ہیں تو ہمارے میں وہ ''متقی'' اور پرہیز گار لوگ پیدا ہوتے ہیں' جیسے تبلیغی جماعتوں کے لوگ ہوتے ہیں' یا جیسے تصوف گزیدہ حضرات ہوتے ہیں۔ جو رات تک نمازیں پڑھتے ہیں اور ذکر و مراقبہ میں مصروف رہتے ہیں لیکن اگر آپ عبادت خداوندی کو قرآنِ کریم کے سب احکامات کی اطاعت تک وسیع کر دیں' تو قوۃ فراہم کرنا' اصل عبادت قرار پا جائے گا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ صدر ضیاء الحق (علیہ ما علیہ) کے دور میں مذہب کا بہت غلبہ ہو گیا تھا اور فوجی جرنیل بھی تسبیح پڑھنے لگے تھے' اس پر اس وقت کے مشہور عالم' علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم نے تبصرہ کرتے وقت کہا تھا کہ اگر جرنیل تسبیح وتہلیل میں مصروف ہو گئے تو سرحدوں کی حفاظت کیا علماء کرام کریں گے۔ جرنیلوں کا تسبیح پڑھنا وہی مذہب کی شنویت کا اثر تھا۔ اگر دین ان جرنیلوں کے سامنے ہوتا تو وہ عبادت الٰہی کے لئے تسبیح کی طرف رجوع کرنے سے زیادہ قوت فراہم کرنے کی طرف توجہ فرماتے' اور قوت کے فراہم کرنے کو تسبیح پڑھنے سے زیادہ عبادت خیال کرتے۔

آج کل جو ظلم وستم اسرائیلی فوج غزہ میں کر رہی ہے اس سے سخت غم و رنج ہوتا ہے۔ وہاں کے ستم رسیدہ معصوم بچوں کے فوٹو دیکھ کر کلیجہ شق ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون غالباً کئی ماہ بعد طبع ہوگا' اس وقت تک حالات شاید درست ہو جائیں لیکن اس وقت جو رنج وغم ہم سب کو ہے' اس لئے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہر شخص یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر عبادت اور تقویٰ کا نتیجہ ہمارے پرہیز گار حضرات ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ بے دست و پا ہونا ہے۔ اس کا واحد حل اس پرہیز گاری کو ترک کر کے قوت حاصل کرنا ہے۔ مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ سے جو ظلم اور ناانصافیاں ان کے ساتھ ہو رہی ہیں' ان میں سے چند آپ حضرات کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ پھر آپ غور فرمائیں کہ ہماری ''پرہیز گاری'' نے ہمیں کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔

(1) قرآنِ کریم نے فرمایا کہ غیر مسلم کبھی مسلمانوں کے دوست اور ہمدرد نہیں ہو سکتے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اگرچہ روس اور امریکہ میں سخت دشمنی اور عناد تھا' یہاں تک کہ امریکہ نے روس کو ختم ہی کر دیا لیکن اسرائیل کو بنانے میں دونوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک سا کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل بنا کر ساری دنیا کے مسلمانوں سے دشمنی لینے کی قطعاً کوئی پروا

نہیں کی۔ آج ساری دنیا میں اختلافات و تنازعات اور بعض اوقات کشت وخون کا واحد سبب اسرائیل کا قیام ہے۔ اس کو عمداً مسلمانوں کے درمیان میں بنایا گیا تاکہ مسلمانوں کو کمزور کیا جائے۔ ورنہ اگر یہودیوں کو نوازنا مقصود تھا تو ان کو امریکہ کی States میں سے ایک سٹیٹ دی جاسکتی تھی لیکن اسرائیل کا اصل مقصد یہودیوں کو نوازنا نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کو ذلیل وخوار کرنا تھا۔ واضح رہے کہ یہودیوں کی کل آبادی ساری دنیا میں کم وبیش دو کروڑ تک ہے۔

(2) اسی طرح روس نے سنٹرل ایشیاء کی مسلمان ریاستوں پر جبراً قبضہ کیا اور ان ریاستوں سے اسلام کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ روس کے خاتمہ کے بعد دوسری ریاستوں کو تو آزاد کر دیا گیا لیکن چیچنیا' داغستان اور Ingushetia انگوشتیا' ماسکو کے آئینی پنجہ میں ہی رہے۔ چیچنیا کے مجاہدین نے بہت ڈٹ کے مقابلہ کیا' لیکن پیوٹن نے سیاسی توڑ جوڑ کے بعد چیچنیا کو پھر فتح کرلیا۔

(3) روس نے افغانستان پر بغیر کسی سبب اور بغیر کسی وجہ کے حملہ' اور مستقل رہنے والی خونریزی کی ابتداء کی۔

(4) کشمیر کے متعلق تو ہم سب کو علم ہے کہ کس پلاننگ اور منصوبہ بندی سے اس کو پاکستان سے چھینا گیا اور ہندوستان نے اس پر جبری قبضہ کیا' اس سے اس خطہ میں مستقل کشت وخون کا دروازہ کھل گیا۔

(5) گزشتہ صدی کی آخری دہائی میں الجیریا میں اسلام پسندوں نے بھاری اکثریت سے انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ لیکن امریکہ اور فرانس نے مل کر ان کو اقتدار میں نہیں آنے دیا اور انہیں حکومت بنانے کی اجازت نہیں دی۔

(6) صومالیہ میں اسلام پسندوں نے 16 سال کی جنگ وجدل کو بند کر کے وہاں امن وامان قائم کر دیا لیکن چونکہ وہ لوگ اسلامی رجحانات رکھتے تھے' اس لئے وہ امریکہ اور روس کو پسند نہیں تھے۔ اسی لئے انہیں حبشہ کی مدد سے اقتدار سے محروم کر دیا' اور صومالیہ عراق کی طرح مستقل قتل گاہ بنا دیا گیا۔

(7) فلپائن کی بھی ایک طویل اور دردناک کہانی ہے۔ چونکہ اس جزیرہ کو سپین کے بادشاہ Phillif کے دوران حکومت ''فتح'' کیا گیا تھا' اس لئے اس کا نام Philipine رکھا گیا تھا۔ سپین کے ''دریافت کرنے'' اور اس پر قبضہ جمانے سے پیشتر یہاں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ خصوصاً Palinane, Mindarao, Sulu میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ 350 سال حکومت کرنے کے بعد سپین نے جب اس کو چھوڑا تو اس وقت بھی یہاں مسلمانوں کا غلبہ تھا۔ لیکن 1898ء میں امریکہ نے سپین سے جنگ کرنے کے بعد' ان جزائر پر قبضہ کرلیا۔ اس وقت سے امریکہ وہاں کے مسلمانوں کے خلاف برابر

لڑائیاں کر رہا ہے اور باہر کے لوگ وہاں لا کر' اس کثرت سے آباد کئے گئے ہیں کہ وہاں مسلمان ایک اقلیت میں ہو گئے ہیں۔ اب وہاں عیسائیوں کی اکثریت ہے اور مسلمان بالکل اقلیت میں ہیں اور بالکل فلسطینیوں کی طرح اپنے ملک میں ہی بے وطن ہو گئے ہیں۔

اس موجودہ ذلت وخواری سے نکلنے کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمان عبادت کے مفہوم کو وسیع کریں' عسکری قوت کے ساتھ ساتھ' معاشی' اقتصادی' سیاسی' مالی' علمی' معاشرتی' اور اتحاد و اتفاق کی قوتیں فراہم کریں اور ان سب قوتوں کے حصول کو عبادت کا درجہ دیں۔ انفرادی پرستش اور عبادت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انفرادی پرستش اکیلے' کی جاتی ہے' اس میں پرستار اور پرستیدہ کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس میں پرستش کرنے والے اور خدا کا تعلق براہ راست ہوتا ہے جبکہ عبادت میں انسان اور خدا کا تعلق ''مرکز'' کی معرفت اور اس کے توسط سے ہوتا ہے اور اس میں اجتماعیت شرط ہوتی ہے۔ مرکز از خود اجتماعیت پیدا کر دیتا ہے۔

یہاں مضمون کے آخر میں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر عبادات کو حقوق اللہ میں شمار کیا جاتا ہے اور ان کو حقوق العباد سے الگ خیال کیا جاتا ہے لیکن قرآنِ کریم کی رو سے حقوق العباد اور حقوق اللہ کی تفریق درست نہیں ہے۔ عیسائیت میں جو تصور تھا کہ خدا کا حصہ خدا کو دو اور قیصر کا حصہ قیصر کو دو' اسی تصور کو ہمارے ہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی شکل میں اختیار کر لیا گیا ہے۔ قرآن کی رو سے انسانوں کے باہمی تعلقات کو قرآن کی رو سے طے کرنا' دین ہے' جس میں تمام حقوق انسانوں کے ہی ہوتے ہیں اور روزمرہ کے معاملات کو درست طور پر طے کرنا' حقوق العباد کو ادا کرنا ہے' جبکہ اسلامی حکومت کے قوانین وضوابط کی اطاعت کرنا' حقوق اللہ کو ادا کرنا ہے' اور چونکہ ان قوانین کی اطاعت سے لوگوں کے معاملات کا تحفظ ہوتا ہے' اس لئے یہ حقوق اللہ' اصل حقیقت کے اعتبار سے حقوق العباد ہی ہوتے ہیں۔ ان دونوں حقوق میں تفریق نہیں ہو سکتی۔ ہمارے ہاں عموماً نماز وزکوٰۃ کو حقوق اللہ کہا جاتا ہے لیکن نماز وزکوٰۃ بھی مقصود بالذات نہیں ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ سے انسانوں کی ایسی تربیت ہو جاتی ہے کہ جس سے انسانوں کے باہمی معاملات نہایت حسن وخوبی سے ادا ہو جاتے ہیں اور ان کے معاملات مستقل اقدار کے مطابق طے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ درحقیقت حقوق العباد کو بہترین صورت میں ادا کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْن(10:10).

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

فنا اور بقا

اَوّل و آخر فنا' باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو' منزلِ آخر فنا

(آخری قسط)

صاحبو! یہ سچ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات ایسے ہیں جو احیائے موتی پر دال ہیں۔ ہم پھر واضح کر رہے ہیں کہ خالقِ کائنات نے دوبارہ زندگی کا عہد کر رکھا ہے۔ وہ ایسا ضرور کرے گا کہ وہ ایسی ذات ہے جو وعدہ خلافی کر ہی نہیں سکتی۔ لیکن ہماری دانست میں اس کے قوانین بے لچک ہیں' وہ اپنے واضح فرمودہ ضوابط کو کسی بھی صورتحال میں توڑتا نہیں ہے کہ سسٹم کی بقا اسی واحد کلئے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے اور اس کا پختہ' ناقابلِ ترمیم قانون یہی ہے کہ جس پر وہ ایک بار موت وارد کر دے وہ حشر سے قبل زندہ نہیں ہوگا۔

سو اس اصولی تناظر میں وہ تمام قرآنی مقامات جن میں ہمیں مُردے زندہ ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں' وہ زندگی جسمانی نہیں' کسی اور نوع کی ہے اور اسی نوع کی زندگی کے ساتھ قرآن کا تصورِ بقا منسلک ہے۔ مثلاً:

(1) اے جماعتِ مومنین! تم اللہ اور رسول ﷺ کی اس دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں زندگی عطا کرنے کے لئے دی جاتی ہے۔ (8:24)۔

(2) پھر موت آ جانے کے بعد ہم نے تم کو از سرِ نو زندہ کر دیا تا کہ احسان مانو۔ (2:56)۔

(3) جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل و برہان ہی کی رُو سے زندہ رہے۔ (8:42)۔

(4) تم کس طرح خدا کی ہستی کا انکار کر سکتے ہو۔ تم مردہ تھے۔ اس نے تمہیں زندہ کیا۔ پھر تم پر موت وارد ہوگی۔ اس کے بعد پھر تم زندہ ہو گے اور اس کی طرف رجوع کرو گے۔ (2:28)۔

ان مقامات کے علاوہ بھی آیات ہیں جنہیں ہمارے عام مترجمین نے معجزاتی تناظرات میں ہی دیکھا

ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا' مذبوح گائے کے ٹکڑے سے مقتول کو زندہ کرنا' سو سالہ موت کے بعد غالباً حضرت عزیرؑ کا زندہ ہو جانا۔ وغیرہ' ہماری نگاہ میں یہ احوال بھی اس بدن کے دوبارہ زندہ ہونے کی گواہی نہیں دیتے۔ ایک وجہ تو وہی ہے کہ اساسی اصول یہی ہے کہ مرنے والے کو اسی دنیا میں دوبارہ زندہ کرنا' حکمتِ الٰہی کے منافی ہے۔ وگرنہ معاذ اللہ اس منزہ ہستی کے کلام میں تعارض و تضاد کے نقشِ سویدا کو قبول کرنا پڑے گا۔

(1) اور جس بستی (والوں) کو ہم نے ہلاک کر دیا محال ہے کہ (رجوع کریں) وہ رجوع نہیں کریں گے۔(21:95)۔

(2) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے کتنی ہی بستیوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں (اور یہ بھی کہ جن کو ہلاک کیا گیا تھا) وہ واپس نہیں لوٹتے۔ (36:32)۔

(3) اللہ لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں (جانیں) قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں (ان کی روحیں) سوتے میں (قبض کر لیتا ہے) پھر جن پر موت کا حکم کر چکتا ہے۔ ان کو روک رکھتا ہے اور باقی روحوں کو ایک وقت مقرر تک کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔(39:42)۔

دیکھئے محولہ آیات میں موجود اموات کو اگر جسمانی اموات پر محمول کیا جائے' پھر تو وفات یافتگان کی قیامت سے پہلے واپسی کی کوئی سبیل صورت نہیں ہے اور اگر ان موتوں کو غیر جسمانی' موتوں پر قیاس کیا جائے پھر اس حیات میں Revival کے امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا اور اس مشاہدے پر ہم سب شاہد ہیں۔

''اور ان کے لئے مردہ زمین بھی ایک نشان ہے۔ ہم نے اسے زندہ کیا ہے اور اس سے اناج نکالا ہے۔ سو یہ اس سے کھاتے ہیں۔''(36:34)۔

باقی اسی دنیا میں جسمانی موت کے بعد جسمانی زندگی کے عمل کو تسلیم کر لینے کی شکل میں افادیت و معنویت کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا کہ اس قسم کا جینا اور مرنا تو نرا پُرا جبر ہے۔ نئی زندگی میں کوئی رضا' نہ مرنے کی کوئی مرضی۔ دوبارہ زندہ ہونے میں ایک انسان کا اتنا ہی ''اختیار'' ہو سکتا ہے جتنا پہلی بار پیدا ہونے میں تھا۔ اس پس منظر میں یہ ''اَن ہونی'' انسانیت پر کیا اثرات مرتب کر سکتی ہے؟ اس ساری حیرت کے بعد حاصل کیا ہوگا؟ صدیوں پرانی اساطیر سے قطع نظر کیا ایسے واقعات کی شہادت' ایسے عجوبوں کی نظیر کسی کے پاس ہے؟ ایک بھی مثال پیش نہیں کی جا سکتی اور نہ کوئی ایسا روحانی عمل ہنوز ایجاد ہو سکا ہے جو اپنے پیارے کو دوبارہ اس دنیا میں لانے پر قادر ہو۔ یہ فکشن ہے' زیادہ سے

زیادہ اسے فکشن کے طور پر ہی قبول کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایسی آرزو ہے جو صرف تصورات کی دنیا میں آباد ہے۔ حقیقی زندگی میں اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ یہ ہمارے خالص جذبات ہیں ہماری شدید محبتیں ہیں جو ہم اپنی محبوب شخصیات کو بجسدِ عنصری حیات یقین کرتے ہیں۔ وگرنہ اسی بدن کے ساتھ اگر کسی کو اس کی آخری آرام گاہ میں زندہ سمجھا جائے تو اس کی عملی صورت کیا ہوگی؟ 6 x 2 کی لحد' جس کی اونچائی بمشکل 3 فٹ ہوتی ہے۔ کیا وہ شخصیت اپنی مرقد کی اتنی جگہ میں زندہ سلامت پڑی ہوئی ہوتی ہے؟ کیا ہماری محبت اتنی گئی گزری ہے کہ ہم اپنے اس پیارے کے لئے قیامت تک یہ قید خانہ تجویز کرتے ہیں؟ ایسا سوچنا ان پیاروں کی کھلی کھلی بے ادبی ہے' واضح گستاخی ہے۔ سو اگر وہ واقعی زیرِ زمین اسی طرح اپنے اسی بدن کے ساتھ زندہ ہیں تو انہیں بالائے زمین نہ لانا بہت بڑی زیادتی ہے۔ ہم تو اس درجہ ظاہر پرست ہیں کہ اللہ نے جب یہ فرمایا کہ میرے راستے میں لڑتے ہوئے مارے جانے والوں کو مردہ مت کہو' انہیں رزق ملتا ہے۔ تو ہم نے انہیں قبور میں نہ صرف انہی ابدان کے ساتھ زندہ ماننا شروع کر دیا بلکہ رزق کو روٹی' پانی وغیرہ سمجھ لیا۔ اسی لئے تو مالک کو یہ کہنا پڑا کہ تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں۔ ہم کیا کریں ہمارے شعور کی سطح اسی بدن کی زندگی تک ہے' ہم شربت' آم' خربوزے' انگور' گندم' جو اور حلوے سے آگے سوچ ہی نہیں سکتے۔ سو ہم اشیائے خورونوش کو ہی رزق سمجھتے ہیں۔ اسی لئے لذتِ کام و دہن میں مصروف رہتے ہیں اور یہی غذائیں ''آگے'' بھیجتے ہیں۔

قبور میں انہی جسموں کے ساتھ زندہ ہو جانے پر تو ہم نے اپنا اعتقاد پختہ کر لیا' حالانکہ اس قسم کی زندگی کے لئے دو شرائط انتہائی ناگزیر ہیں۔

(1) جسم

(2) قبر

آپ نے کبھی سوچا کہ دنیا میں کتنے مرنے والے ایسے ہیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے اپنے اجسام فنا کر بیٹھتے ہیں۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ کتنے ہی مرنے والے ایسے ہیں جو قبور میں دفن نہیں ہو پاتے۔ انہیں مرنے کے بعد کس طرح اور کہاں زندہ کیا جاتا ہے؟۔۔۔؟

بات تو بڑی سادہ سی تھی کہ جب بطور کلئے کے فرما دیا کہ مرنے کے بعد کوئی قیامت تک زندہ نہیں ہوگا۔ پھر ''قبر'' میں زندہ ہونے/ رہنے کے امکان کو بھی مسترد کر دیا۔

> ''پھر یقیناً تم ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد مرنے والے ہو۔ پھر بلاشبہ تمہیں روزِ قیامت (قبروں سے) اٹھایا جائے گا'' (23:15-16)۔
> (مترجم پیر کرم شاہ صاحب)۔

قرآن مجید میں کسی ایک جگہ یہ اصل الاصول

بیان نہیں ہوا کہ مرنے والے قیامت تلک رُکے رہیں گے' نیز وہ اس دنیا میں واپس نہیں آئیں گے۔ جگہ جگہ یاددہانی کرادی گئی ہے کہ طبعی عمر جب اپنے انجام کو پہنچ جائے گی تو قصہ تمام ہے۔ اب اسی پیکر کے ساتھ اس دنیا میں آنے کا کوئی سوال' کوئی امکان نہیں رہا۔ ایسا اس لئے بطور قانون کے فرما دیا کہ یہ دنیا دارالعمل ہے' امتحانی مرکز ہے۔ یہاں Re-Appear ہونے کا کوئی چانس قوانینِ خداوندی میں نہیں رکھا گیا۔ اگر ''جہانِ فردا'' کا ''پھیرا'' لگا لیا ہے تو اب وہیں رہو' اپنے اعمال کو محسوس نتائج میں دیکھو' گویا اب بھگتو جو کیا ہے! یہ کوئی مذاق نہیں ہے کہ پورا موقع ملنے کے بعد کوئی یہ کہے کہ اے خدا! پلیز! ایک باری اور دے دیجئے۔

اس سلسلے میں مزید آیات دیکھئے:

[23:107, 32:12, 39:58, 42:47, 63:10-11]

رہا یہ تجسس کہ مرنے کے بعد فائنلی جب ہم دوبارہ زندہ کئے جائیں گے تو ہماری صورت کیا ہوگی؟ کیا بالکل اسی طرح' اسی بدن' اسی شعور' اسی کیفیت میں کھڑے کر دیے جائیں گے؟ تو ہم کون ہوتے ہیں اس راز سے پردہ سرکانے والے! اس لئے کہ فی الوقت ہماری عقل اس عظیم سِر تک رسائی حاصل نہیں کرسکی۔

آپ غور کیجئے کہ ہم ایک موت سے ایک زندگی تک کا سفر مکمل کر چکے ہیں۔ جی ہاں قرآنِ مجید نے ہمارے وجود پکڑنے سے پہلے کے ''زمانے'' کو موت کا عرصہ کہا ہے اور پھر جب ہم صورت گری کے عمل میں سے گزر کر ایک باضابطہ پیکر میں ڈھل گئے تو اس دورانئے کو زندگی کہا۔ اب کہئے اُس موت سے اِس زندگی تک کی مسافرت ہم نے مکمل بھی کر لی ہوئی ہے اور ہمیں اس Process کی خبر تک نہیں ہے۔ آگے بڑھئے' ہمت کیجئے' ایک ایک مرحلے کو ترتیب دیجئے' کوئی خاکہ بنائیے' کہاں سے شروع کریں گے؟ کس کس پڑاؤ کی جزئیات بیان کریں گے؟ یاد رکھئے! انسان ایک درجے میں قابلِ ذکر شے نہیں تھا۔ (76:1) اور یہ بھی نہ بھولئے کہ مالک نے قرآنِ مجید میں دو موتوں اور دو زندگیوں کا تصور دیا ہے۔ (2:28 +16-23:15)۔ ایک سائیکل ہم نے مکمل کر لیا ہوا ہے۔ دوسرے Re-Current Period کا ہم حصہ ہیں۔

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک!

تاہم ہمارا اپنے رب کے اس فرمودے پر کامل ایمان ہے کہ:

> اُس زندگی (یعنی اُخروی زندگی) میں زمان Time کے متعلق (انسان کا) شعور بدل جائے گا۔ (20:103-104), (10:45), (23:113), (46:35)۔

اور اس ایک زاویے میں تغیر برپا ہونے سے کتنی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو جائیں گی؟ یہ ایسا بسیط مضمون ہے کہ

فلسفی، مفکر، سائنس دان سب مل کر اس قلزم سے ان گنت موتی برآمد کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

آخر میں ہم بار دگر عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ بقایا ہمیشگی کسی ''چیز'' کو حاصل ضرور ہے۔ لیکن بصد معذرت وہ یہ بدن یا یہ جان ہرگز نہیں۔ انہیں حقیقی ابدیت اور سچی سرمدیت کا اعزاز کچھ ایسا زیبا نہیں ہے اور اسکی وجہ بڑی ہی ظاہر و باہر ہے کہ جو شے وقتی طور پر بھی فنا ہو جائے۔ اس پر دوام کی صداقت صادق نہیں آ سکتی۔ اس بدن کے زندان میں آنے سے قبل ''ہم'' بہرحال کسی اور ایسے ہی جسم کے بندی خانے میں اسیر نہیں تھے۔ اس طرح بدن کا معاملہ جب ختم ہو جاتا ہے تو پھر یہ سر یرڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ یہی صورت جان کے ساتھ ہے کہ جب جان نہیں رہتی تو نہیں رہتی۔ پھر اس موصوفہ کے تعین کا منطقہ تلاش نہیں کیا جا سکتا۔

جس ''چیز'' کو خلود یا لازمانی حالت میسر ہے' اسے قرآن نے ''روح'' کہا ہے۔ اسے تسلسل کا انعام (بطور امکان) ضرور حاصل ہوا ہے۔ یہ عفیفہ بدن کی محتاج ہے نہ جان کی۔ اللہ کی کتاب میں اسے ''نفس'' سے بھی تعبیر کیا ہے۔ عالی دماغوں نے اسے ہی ''ذات'' سے موسوم کیا ہے۔ ان کی نگاہ میں یہ ذات ہی ہے جو فنا نہیں ہوتی۔ یہی سدا باقی رہنے کی فطری صلاحیت رکھتی ہے اور حسنِ اتفاق یہ تحفہ بجز انسان کسی اور مخلوق کو نصیب نہیں ہوا۔ اسی کی بدولت انسان اشرف المخلوقات کہلا سکتا ہے (بشرطیکہ قوانینِ خداوندی کے مطابق وہ اسے درست خطوط پر نشو ونما دے لے) لیکن وہ ایسا کرنے سے اگر اپنے اختیار کی وجہ سے گریز پا ہو جائے تو محض انسان ٹائٹل کے کارن وہ نہ تو دیگر مخلوقات پر فائق ہو سکتا ہے نہ اُسے بقایا ابدیت کے ارمغان سے سرفراز کیا جا سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اس خیال کی غالباً سب سے زیادہ اور پرزور تائید کی ہے کہ ''حیاتِ جاوید'' ہر انسان کا شرف نہیں ہے۔ وہ جنہوں نے اپنی ذوات کو نمود کے خوبصورت مراحل میں سے گزارا ہے وہی باقی رہیں گے۔ باقیوں کو باقی رکھ کر کیا کرنا ہے؟ دن رات کتنے ہی جان داروں کو ہم بے جان ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ انہیں بھلا بقا ایسے عظیم اعزاز سے معزز کرنے کا کوئی جواز ہے؟ باقی رہنا بازیچۂ اطفال نہیں ہے۔

اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کو روح کا انعام خود خدا نے عطا فرمایا ہے۔ تاہم واضح رہے کہ خدا نے خود کو کہیں ''روح'' نہیں کہا۔ اس لئے اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ خدا نے اپنے وجود (وجود اور بدن میں فرق حدِ نظر رہے) سے کچھ جدا کر کے انسان کو دے دیا ہے۔ اگر یہی بات ہوتی تو پھر بندے اور اللہ میں فاصلہ نہ رہتا کہ جزو اور کل میں ماہیت کی تفریق تو ہو سکتی ہے' جوہر دونوں کا ایک

ہی' ہوگا۔ غالبؔ غالباً نہیں یقیناً غلطی خوردہ تھے جو یہ کہہ بیٹھے:

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ ''انا البحر''
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

قطرے اور سمندر کی مثال سے اس موقف بلکہ عقیدے کو سمجھانے والی کہانی اگرچہ اب پرانی ہو چکی۔ مگر مانا کہ قطرے میں قلزم کی خصوصیت ہوتی ہے لیکن انسان کو خدا نے اپنی ذات کا حصہ کہیں قرار نہیں دیا۔ ہاں انسان اسی اعلیٰ خالق کی تخلیق ضرور ہے۔ اور اس شاہکار تخلیق کو اس نے اپنی حکمت سے ''روح'' کا امتیاز بخشا ہے۔ اور بے شک یہ اضافی وصف' یہ زبردست انعام کسی اور مخلوق کو نہیں ملا۔

سادہ تر الفاظ میں روح سے مراد الوہی توانائی سے شکتی پائی ہوئی وہ حیران کن استعداد ہے جو علم بالحواس کی وساطت سے صحیح نتائج تک رسائی حاصل کر لیتی ہے۔ قرآن اس ذریعے کو ''فواد'' کہتا ہے۔ قرآن کے مفاہیم تک درست رسائی حاصل کرنے والے مفکرین اسے Mind کہتے ہیں۔ گویا روح کو اعلیٰ ترین حالت کی Intellect بھی کہا جا سکتا ہے اور یہی Divine Energy کا وہ شمہ ہے جس پر موت یا فنا وارد نہیں ہو سکتی۔ یہ برابر سفر میں رہتی ہے۔ اگلے جہانوں میں یہی شے منتقل ہوتی ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ بادی النظر میں یہ زندہ شخص سے ہی ''جڑی'' ہوئی ہوتی ہے لیکن اس کے بدن پر فنا آتے آتے یہ آگے بڑھ چکی ہوتی ہے۔ مکی سردار امیہ بن خلف نے بلالؓ حبشی کی ننگی کمر پر دھوپ میں جو کوڑا رسید کیا تھا' وہ ''روحانی برق'' میں منتقل ہو گیا' وہی توانائی آگے چل کر قادسیہ کی جنگ میں سپر پاور ایران کی فتح کا کارن بن گئی۔ اگر آئزک نیوٹن نام کا شخص اس دنیا میں نہ ہوا ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ آئن سٹائن کے کام سے دنیا آگاہ ہو پاتی۔ ادھر کوئی 43 برس پہلے ایک خوب رو نوجوان جو چھ دن اور چھ راتیں متواتر جاگتا رہا۔ پھر صورتحال ایسی آن پہنچی کہ وہ مورچے میں بیٹھ یا لیٹ کر جنگ جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ مدمقابل فوج پر توپچیوں کے ذریعے حملہ کرانے کے لئے اس کا سینہ تان کر کھڑا ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ وہ قدآور نوجوان کھڑا ہو کر اپنی بٹالین کو ہدایات دینے لگ گیا۔ تہور اور شجاعت کی لازوال داستان رقم کرنے والے اس نوجوان نے جامِ شہادت نوش کر لیا۔ اس کا جسم توپ کا گولہ لگنے سے ختم ہو گیا مگر اس کی روح زندہ رہی جو ہر اس شخص میں نفخ ہو گئی جس نے اس خطے میں آزادی کا سانس لیا۔ میجر عزیز بھٹی کروڑوں لوگوں میں تقسیم ہو کر سدا کے لئے زندہ ہو گیا۔ کیسے؟ روح تو ناقابل تقسیم اکائی ہے۔ اس کی تفرید کو توڑنے والا آلہ ایجاد ہونا ممکن نہیں۔ پھر یہاں روح منقسم کیسے ہو گئی؟ ہمیں یہ تو خبر نہیں کہ یہ کیسے ہو گیا تاہم یہ ضرور جانتے ہیں جو جائیداد ناقابل انقسام ہو' وہ پوری کی پوری ہر حصہ دار کی ملکیت ہوتی ہے۔ اوشو کہتا ہے: میرا دل

اتنا بڑا اور مکمل ہے کہ میں اسے کاٹے بانٹے بغیر پوری دنیا کے ہر شخص میں ''تقسیم'' کرسکتا ہوں۔ میرا پورے کا پورا دل اس جہان کے ہر فرد کا یکساں اثاثہ ہوسکتا ہے۔ کتنوں کے دل اس بہترین زندگی کی صفت سے متصف ہو چکے ہیں؟ اور کتنے ہیں جو دلوں کی ایسی بے نظیر زندگی کا شعور حاصل کر چکے ہیں؟ واقعتاً اکثروں کو شعور کا نور نصیب نہیں ہوا۔ اور یہی وہ ''عاقل'' ہیں جو مابعد قیامت زندگی کے تسلسل کے انکاری ہیں۔

باقی رہنے والی اس روح کی آئیڈیل صورت یہ ہے کہ قوانین خداوندی کی یہ بہترین پارکھ ہوتی ہے۔ یہ ایسی عقل کو جلا بخشتی ہے جو انسانیت کے لئے فیض رساں ہوتی ہے اور ایسے علم کو فروغ پہنچاتی ہے جو اعلیٰ انسانی اقدار کی بڑھوتی میں معاون کا کردار ادا کرتا ہے۔ بلا تمیزِ مذہب و ملت سب کو سیراب کرنے کی خوگر یہ روح حریص نہیں ہوتی۔ یہ موجودات کی نفی نہیں کرتی' اس کو نعمتِ خداوندی یقین کرتی ہے۔ خود بھی اس سے سرشار ہوتی ہے اور اِک جہان کو اس سے فیضیاب و سرفراز کرتی ہے۔ اس کا طغرائے امتیاز یہ بھی ہے کہ جسمانی موت سے یہ خوف زدہ نہیں ہوتی' کیونکہ اسے ادراک ہے' روح وجود کا مرکزہ ہے اور موت کا فرشتہ اسے کبھی نہیں چھوسکتا۔ اسی کو آگے جانا ہے' بہت آگے' حشر سے بھی آگے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ روح نے زندگی پالی ہوئی ہو یعنی نشو ونما حاصل کر لی ہوئی ہو وگرنہ بقول شخصے:

''ایک پلاسٹک کا پھول کبھی پیدا نہیں ہوتا' کبھی مرجھاتا بھی نہیں۔''

ہاں یاد آیا یہ زندہ روح خود آگاہ تو ہوتی ہے مگر خود پرست نہیں ہوتی بلکہ خدا پرست ہوتی ہے۔ ہر قانونِ خداوندی پر عمل پیرا ہونا' اس کا شعار ہوتا ہے۔ اسے عرفان حاصل ہوتا ہے کہ خدا کے وضع فرمودہ قوانین کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ ناقابلِ ترمیم و تبدیل ہوتے ہیں۔ اسے ان آسمانی قدروں میں حیاتِ جاوداں کا پورا روڈ میپ نظر آ رہا ہوتا ہے۔ وہ زندگی کو جوئے رواں یقین کرتی ہے۔ افراد کی اموات سے یہ زندہ رو در کتی نہیں ہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی ہے کہ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ حزن اور شکوہ اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے۔ اسی لئے ترکِ دنیا کا مخصوص رہبانی تصور اس کے ہاں قطعاً موجود نہیں ہوتا۔ اس وسیع تر ادراک کی بدولت یہ اپنی حیاتی میکانکی نہیں بلکہ تخلیقی سطح پر گزارتی ہے۔ انسانیت جذبوں کی نفی نہیں کرتی۔ دوسرے کے دکھ کو محسوس کر کے تڑپ اٹھتی ہے۔ خدا کے بعد آزادی کو اس دنیا کا محسن مانتی ہے۔ فطری احساسات پر پہرے نہیں بٹھاتی۔ خوف زدہ کر کے یا ہوس میں مبتلا کر کے کسی یوٹوپیا ہاؤسنگ سکیم میں پلاٹ الاٹ نہیں کرتی بلکہ نتائج کی محکمیت ایسی بہشتِ بریں پر ایمان و یقیں کو پختہ کرتی ہے۔ زمینی تلخیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی جرأت عطا کرتی ہے۔ تعمیری خوابوں کو عملی تعبیریں بخشتی ہے نہ کہ سچی

تعبیروں کو جھوٹے خوابوں کے رنگین غلافوں میں ملفوف کرتی ہے۔ انفرادی زندگی پر قومی و اجتماعی زندگی کو ترجیح دیتی ہے۔ کسی بھی قسم کی Exploitation کی اس کے ہاں سرے سے کوئی گنجائش موجود نہیں ہوتی۔ اس لئے خواہ مخواہ کی Mystery کو مسترد کرتی ہے۔ متداول Mystification کی حوصلہ شکنی کرتی ہے۔ زندگی کے حقائق سے اس بسالت کے ساتھ نبرد آزما ہونے کی قوت دیتی ہے کہ پست ہمتی اور تنگ نظری کبیرہ گناہوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ بے کار تاویلات کے گورکھ دھندے میں الجھتی ہے نہ یاس وقنوط کو ہوا دیتی ہے۔ عہدہ و منصب کی امیدوار نہیں ہوتی لیکن اپنے اردگرد موجود انسانوں کی بہبود کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتی ہے۔ تکریمِ آدمیت اس کا مستقل وظیفہ ہوتا ہے۔ اسے صلے کی تمنا اور ستائش کی پروا بھی نہیں ہوتی کہ اسے کامل بھروسا ہے احسان اعمال کے نہایت دور رس نتائج ہوتے ہیں۔ اور نتائج آفرینی کا یہ پرکشش اور پرنور عمل ہی اس کا ثمر ہوتا ہے۔ اور اس میں اس کی بقا کا راز پوشیدہ ہے۔

صاحبو! سچ یہی ہے کہ بقا کو فنا ہے اور نہ فنا کو بقا ہے۔ بالکل آغاز میں ہم نے سورۃ رحمٰن کی آیت کو عام ترجمے کے ساتھ Quote کیا تھا۔ اس کا قرآنی مفہوم یہ ہے:

کائنات کی ہر شے میں ہر آن تغیر واقع ہوتا رہتا ہے

اور

اس مضمون کا اگلا حصہ یہ ہے

صرف خدا کی ذات ہے جو تغیر سے ماورا ہے۔

(55:26-27)۔

اسی فنا کو قرآن میں ہلاکت بھی کہا گیا ہے۔ (28:88) اور ظاہر ہے ہلاکت اسی پر وارد ہوگی جو ہلاک ہونے کا امکان رکھتا ہے۔

عظیم مفکرِ قرآن کا کہنا ہے:

''انسان جو کچھ طبیعی دنیا میں حاصل کرتا ہے (یعنی مادی سامان و اسبابِ حیات) وہ تغیر پذیر بھی ہوتا ہے۔ اور ختم ہو جانے والا بھی۔ لیکن اعمالِ صالحہ کا اثر جو انسان کی ذات پر مرتب ہوتا ہے' وہ تغیر ناآشنا ہے اور باقی رہتا ہے یعنی موت کے بعد آگے جاتا ہے۔ اسی کو قرآن نے باقیات الصالحات سے تعبیر کیا ہے۔'' (18:76), (18:46)۔

گویا اللہ کی ذات تو فنا سے منزہ ہے ہی اور جو صبغۃ اللہ میں رنگین ہو جائیں یعنی قوانین خداوندی پر پورے پورے عامل ہو جائیں ان کی ذوات بھی بہترین بشری دوائر میں فنا ناآشنا ہو سکتی ہیں۔

☆☆☆

دوستو! آخر میں ہمیں اپنے عجز کا اظہار ضرور کرنا

ہے کہ یہ وضاحت حیات بعد الممات سے وابستہ Phenomenology کی محض ایک Dimension ہے۔ Life After Death اس ممکنہ تصریح کے باوصف کئی طرفوں سے یقیناً ایک کائناتی راز ہے لیکن سنجیدہ تفکر و تدبر کا مسلسل عمل مزید حیران کن جہتیں یقیناً منکشف کر سکتا ہے۔ تاہم یہ ہمارا محکم ایمان ہے کہ جہانِ فردا پر کامل ایقان کے بغیر زندگی کے بامعنی ہونے کا تصور مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ اگر مرنے کے بعد جی نہیں اٹھنا تو پھر ہر ضابطہ اضافی ہے۔ گر زندگی کسی مربوط تسلسل کا عنوان نہیں ہے تو پھر سب ایک دم عبث ہے' باطل ہے' یکسر Absurd!

اور حیات کا چکرا دینے والا ارتباط شہادت دیتا ہے کہ یہ زیست بے معنی/ لایعنی/لغو ہرگز نہیں۔ یاد رکھئے! کسی حقیقت کو مان کر اس کی کنہ اور لم کو نہ جاننا (یا کم از کم جاننے کی کوشش نہ کرنا)' اس حقیقت کی انتہائی اہانت کے مترادف ہے۔ ہمیں حیات بعد الممات سمیت تمام رازوں کو آگے بڑھ کر بے نقاب کر دینے کی تخلیقی سعی میں پیہم محو رہنا چاہئے لیکن مسلسل جستجو بڑی ہی آہن گداز محنت کا سرنامہ ہے۔ ایسا وہی مومن کر سکتا ہے جو اللہ کے آرڈر پر تسخیرِ فطرت کے پروگرام سے اس طرح منسلک ہو کہ اگر اس کی اس عبادت کا ایک لمحہ بھی قضا ہو گیا تو ہزار سال کی عبادت بھی اس کی تلافی نہیں کر سکے گی۔ اور یہ عظیم الشان نصب العین کسی روایتی کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

تکملہ: یہاں ایک توضیح از بس ناگزیر ہے کہ مُردوں کو اسی دنیا میں ''زندہ'' کرنے کے شائقین ایک دلیل اکثر دیا کرتے ہیں کہ یہ معجزہ ہے اور معجزے کی تعریف ان کی نظر میں یہ ہے:

خدا کی قدرت کا اظہار

وہ قادر ہے' وہ کچھ بھی کر سکتا ہے اور کبھی کبھی وہ اپنے ہی بنائے ہوئے اصول وقوانین کو توڑ کر یہ منظر دکھا دیتا ہے کہ اصول وقوانین میرے پابند ہیں' میں اصول وقوانین کا پابند نہیں ہوں اور اگر اللہ تعالیٰ اسی جہان میں اپنے ہی بنائے ہوئے ضوابط وقواعد کو استثنائی صورت حال میں توڑ کر نہ دکھاتا تو اس کی لامتناہی قدرت بعضوں کی نگاہ میں مظنون و مشکوک قرار پاتی۔ ٹھیک ہے یہ کائنات بحیثیت مجموعی اس کے وضع کردہ عمومی قوانین کے مطابق ہی رواں دواں ہے لیکن کہیں صدیوں کے بعد وہ مخلوق کو ایسا عجیب نظارہ بھی دکھا دیتا ہے کہ عام قاعدہ' متداول ضابطہ' مروج کلیہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ اور ایسا وہ بطور معجزہ کرتا ہے جو اس کے کسی نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس اعجاز کے ظہور میں اس نبی کا اپنا کوئی کمال نہیں ہوتا' بلکہ اس نبی کو خود ایک لمحہ پہلے خبر تک نہیں ہوتی کہ کیا ہونے والا ہے؟ اس Thesis کی روشنی میں احیائے موتےٰ کے قائلین فرماتے ہیں کہ درست ہے اللہ رب العزت کا عمومی قانون یہی ہے' مرنے کے بعد وہ قیامت ہی کو مردوں کو زندگی بخشے گا' لیکن

جو خدا تب یہ کرسکتا ہے' اس کے لئے اسی دنیا میں اب ایسا کر دکھانا کیا مشکل ہے؟ سو بطور معجزات چند بار اس نے مرے ہوؤں کو یہیں اس جہانِ آب و گِل میں زندہ کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایسا کرنے پر بھرپور قدرت رکھتا ہے۔ نیز اپنے ہی بنائے ہوئے عام قانون کو معطل کر کے اس نے یہ بھی باور کرا دیا ہے کہ میں قاعدے قانون میں جکڑا ہوا میکانکی خدا نہیں ہوں' میں مختارِ کُل ہوں۔

بجا ارشاد! لیکن اس محولہ صراحت کے ضمن میں ہمارے دو ایک تحفظات ہیں جنہیں ہم نہایت ہی سادہ سوالات کی شکل میں بیان کرنا چاہتے ہیں کہ مقصود مجادلہ نہیں مسئلہ مذکورہ کی تفہیم ہے۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ ضابطہ شکنی کا یہ نظارہ کیا ان خوش نصیبوں کے حصے میں ہی آ سکتا ہے جنہوں نے کسی نبی کا زمانہ پایا ہے؟ یا قیامت تک اس معجزاتی صورت حال کی گنجائش ہے؟ کیونکہ حضورﷺ کے بعد کسی نبی نے اب مبعوث نہیں ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اب تا حشر ایک ہی قاعدہ نافذ رہنا ہے' عمومی قانونِ خداوندی کو ایک ساعت کے لئے بھی Suspend نہیں ہونا تو ان گنت لوگ خدا کی قدرت کے شاہد بننے سے محروم رہ جائیں گے' چنانچہ ان کی نگاہ میں خدا کی لامتناہی قدرتیں مشکوک ہی قرار پائیں گی۔ ہاں ختمِ نبوت کو تسلیم نہ کرنے والے ممکن ہے پرامید ہوں کہ جب نئے نبی کا ظہور ہوگا یا ہوا کرے گا تو وہ اپنے ساتھ چند معجزات بھی لایا کرے گا' یعنی اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اپنے قوانین کو توڑ کر اپنا حقیقی قادر ہونا ظاہر کر دیا کرے گا۔ لیکن بصد معذرت ہم یہ آس بھی نہیں لگا سکتے کیوں کہ اب کسی نبی نے نہیں آنا لیکن کیا ہے کہ ایسے بے شمار صلحائے امت بھی تو موجود ہیں جو بظاہر حضرت اقدسﷺ کو آخری نبی اور رسول یقین کرتے ہیں لیکن جناب عیسیٰ علیہ السلام کی آمدِ ثانی کے وہ قائل ہیں۔ اس طرح ان کی آرزو بھی پوری ہو جائے گی یعنی حضرتِ مسیحؑ جب تشریف لائیں گے تو ظاہر ہے متعدد معجزات بھی وہ دکھائیں گے۔ کتبِ روایات مسیح موعود کے متوقع معجزات سے بھری پڑی ہیں اور پھر وہ ایسے نبی ہیں جنہوں نے اپنے پہلے دورِ نبوت میں جو معجزے دکھائے' ان میں اہمیت کے اعتبار سے سرِ فہرست مُردوں کو زندہ کرنا ہے۔ اب جب وہ آسمانوں سے اتریں گے تو خدا کی لامتناہی قدرت کے اظہار کے طور پر کافی امکان ہے وہ اسی دنیا میں مرے ہوؤں کو زندہ کر دیں گے لیکن ہم کیا کریں کہ ہمارا فکر و نظر جانے کیوں ختمِ نبوت کی اس تشریح کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ ہمیں ہر احمدی دوست' ہمیں ہر حیاتِ مسیحؑ کے قائل مسلمان نے یہ نکتہ سمجھانے کی از حد کوشش کی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد اگر نیا یا پرانا ایک آدھ نبی آ جائے تو آپﷺ کی ختم نبوت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ آپﷺ کا عظیم الشان مرتبہ موجود و برقرار رہے گا۔ یقیناً یہ ہماری ہی عقل کا قصور ہوگا کہ ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ جو

آخر میں آئے گا' وہی آخری نبی ہوگا اور پھر ایسی ختمِ نبوت سے کیا حاصل جو ضرورتِ نبوت کا خاتمہ نہ کر سکے؟ اگر نبوت کا Vacuum حضورﷺ کے بعد بھی موجود ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس خلا کو نیا نبی پُر کرتا ہے یا پرانا؟ ہماری نظر میں آپ آخری رسولﷺ اور نبیﷺ ہیں' یہی آپﷺ کی فضیلت کا سب سے خوبصورت تاج ہے۔

اس تناظر میں حقیقی ختمِ نبوت کو ماننے والے تو خدا کی لامتناہی قدرتوں کے نظارے سے پھر محروم اور تہی رہ گئے۔ اب ہمیں یہ نہیں معلوم کہ کرامات کے قائلین یہ عقیدہ رکھتے ہیں یا نہیں کہ ایک ولی کے ہاتھ پر بھی احیائے موتی کی ربانی قدرت ظہور کر سکتی ہے یا نہیں؟

اس پہلو سے ہمارا دوسرا اور اصل سوال یہ ہے کہ اگر خدا کی لامتناہی قدرت کے اظہار کے لئے یہ ضروری ہے کہ خدا اپنے ہی تشکیل فرمودہ اور تخلیق کردہ اصول و قوانین کو ''کبھی کبھار'' توڑ کر بھی دکھا دیا کرے وگرنہ اس کی قدرتیں محدود تصور ہوں گی تو کیا خدا نے یہی ایک کلیہ ترتیب دیا ہے کہ وہ مرنے والوں کو قیامت سے پہلے زندہ نہیں کرے گا' انہیں دنیا میں واپس آنے کا موقع نہیں دے گا؟ یا اس نے اپنی آخری کتاب میں متعدد اور مطلق (Absolute) قوانین بھی دیے ہیں؟ کیا ان حتمی کائناتی اور معاشرتی ضوابط کے حوالے سے بھی یہ گنجائش موجود ہے کہ ''کبھی کبھار'' بطور معجزہ وہ ٹوٹتے بکھرتے ہوئے دکھائی دیں گے؟ ہم یہاں یہ ضرور واضح کر دیں گے کہ خدائے وحدہ لاشریک اور معبودِ برحق کا سب سے بڑا امتیاز ہی یہ ہے کہ وہ اپنی سنت بدلتا نہیں ہے' وہ اپنے کلمات سے منحرف نہیں ہوتا' یعنی اس کے بنائے ہوئے اصول و قوانین اٹل ہیں' ناقابلِ ترمیم' اسی لئے وہ قابل بھروسا ہیں۔ رہی اس کی قدرت بلکہ لامتناہی قدرت تو اس کا سوال ہی نہیں ہے' ''لامتناہی قدرت'' کے حوالے سے عبث بحثیں پچھلی اور اس سے جڑی صدی کے مناظروں کا موضوع تھیں جو اب قصہ پارینہ ہو چکی ہیں کہ سنجیدہ اور معقول طبقے نے دیکھ لیا ہے کہ وہ مناظرین مسئلۂ امکانِ کذب سے لے کر عجیب و غریب لایعنیتوں تک پہنچے ہیں۔ یہ گفتگو ہی نہیں کہ خدا کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا کہ اس پس منظر میں آزاد تلازماتِ خیال ایک ہی جست میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ سکتے ہیں۔ جس کے دل میں اللہ کی عظمت کا معمولی سا بھی احساس موجود ہے وہ اس ''علمِ کلام'' کا حصہ نہیں بن سکتا۔

ہمیں تو اپنے متذکرہ سوال کو صرف قرآنی قوانین کے مدار میں رکھ کر دیکھنا اور دکھانا ہے۔ جی ہاں! اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جہاں بطور قانون یہ فرمایا ہے کہ مرنے والے اس دنیا میں واپس نہیں آئیں گے۔ وہاں اس نے اور بھی قوانین دیے ہیں۔ اور ان قوانین سے پوری کتابِ مبین مزین ہے۔ ہم مشتے نمونہ از خروارے صرف دو قوانین کا حوالہ دیتے ہیں۔ دِل پر ہاتھ رکھ کر

بتائیے کہ کیا ان کے اعتبار سے بھی خدا کی لامتناہی قدرت متناہی متصور ہوگی جب تک خدا ان قوانین کو بھی توڑ کر نہیں دکھا دیتا؟ صاحبو! ہم نے اوپر ختمِ نبوت کا ذکر عمداً کیا تھا۔ اللہ نے اپنے تحریر کردہ آئین یعنی قرآن میں لکھ دیا ہے کہ حضرت محمد ﷺ سلسلۂ انبیاء کے آخری صاحب ہیں۔ کیا خدا اپنی قدرت کے اظہار کے طور پر حضور ﷺ کے بعد نئے نبیوں کو مبعوث کرسکتا ہے؟ (آمدِ مسیحؑ کے حوالے سے چاہے ہمارے روایتی لاکھ تاویلیں کرتے ہوں، پھر بھی ذرا جرأت کر کے کہیں ہاں ''کبھی کبھار'' وہ محض اپنی قدرت ظاہر کرنے کے لئے کسی نبی کو بھیج سکتا ہے)۔ سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ نے چند رشتوں کی تفصیل فراہم کی ہے اور بطور قانون فرما دیا ہے ان سے نکاح نہیں ہوسکتا۔ کیا خدا محض اپنی قدرت کے ظہور کے خیال سے اپنے بنائے ہوئے اس قانون کو توڑ سکتا ہے؟ وقس علیٰ ھٰذا!

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہوچکی ہے۔ یہ جلدیں بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ خصوصی رعایتی ہدیوں پر دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ	صفحات	خصوصی رعایتی ہدیہ	نام کتاب	سورہ	صفحات	خصوصی رعایتی ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	120/-	سورہ روم	(30)	444	250/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	70/-	سورہ لقمان	(31)		
سورہ النحل	(16)	334	150/-	سورہ سجدہ	(32)		
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	175/-				
سورۃ الکہف ومریم	(18)(19)	511	200/-				
سورہ طٰہٰ	(20)	416	180/-				
سورۃ الانبیآء	(21)	336	150/-	سورہ یٰسٓ	(36)	164	100/-
سورۃ الحج	(22)	380	180/-				
سورۃ المؤمنون	(23)	408	200/-				
سورۃ النور	(24)	263	150/-				
سورۃ الفرقان	(25)	389	200/-				
سورۃ الشعرآء	(26)	453	230/-				
سورۃ النمل	(27)	280	170/-				
سورہ القصص	(28)	334	200/-	29واں پارہ		541	250/-
سورہ عنکبوت	(29)	387	220/-	30واں پارہ		624	250/-

ان خصوصی رعایتی ہدیوں پر مزید کوئی کمیشن/ رعایت نہیں دی جاتی۔ خرچہ ڈاک اس کے علاوہ ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغازِ سُخن

آپ کے زیرِ نظر کتاب سورۃ یٰسٓ ۔''مطالب القرآن فی دروس الفرقان'' تحریری ریکارڈ ہے ان ہفتہ وار دروس کا جو علامہ غلام احمد پرویزؒ (1903-1985) نے 20 جون 1980ء سے 15 اگست 1980 کے دوران بمقام 25۔بی گلبرگ 2 لاہور ارزانی فرمائے ۔قرآنِ کریم کے حیات بخش پیغام کو عام کرنے کے لئے ان دروس کو شائع کرنے کی سعادت بزم طلوعِ اسلام لاہور کو حاصل ہورہی ہے۔(**فجزاھم اللہ احسن الجزآء**)

علامہ غلام احمد پرویزؒ مرحوم ایک متبحر عالم تھے ان کا شمار بیسویں صدی کی اُن نابغۂ روزگار علمی شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے زورِ قلم اور قدرتِ بیان کے سبب اسلام کے دفاع اور جدید عصری تقاضوں اور مسائل کا قرآنی حل پیش کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔انکسارِ طبع کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ اپنے آپ کو قرآنِ کریم کا ادنیٰ طالب علم کہا اور سمجھا۔

علامہؒ مرحوم پینتالیس سے زائد معروف کتابوں کے مصنف تھے جن میں دائرۂ معارف القرآن کی آٹھ جلدیں' من و یزداں' ابلیس و آدم' جوئے نور' برقِ طور' شعلۂ مستور' معراجِ انسانیت' جہانِ فردا اور کتاب التقدیر۔لغات القرآن (4 جلدیں)' تبویب القرآن (تین جلدیں)' نظام ربوبیت' انسان نے کیا سوچا' اسلام کیا ہے' ISLAM A CHALLENGE TO RELIGON تصوف کی حقیقت' اسلامی معاشرت' سلیم کے نام خطوط (3 جلدیں)' طاہرہ کے نام خطوط (2 جلدیں)' قرآنی فیصلے (2 جلدیں)' اقبال اور قرآن (2 جلدیں)' شاہکارِ رسالت' فردوسِ گم گشتہ' سلسبیل' مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں' جہاد' قرآنی قوانین' ختمِ نبوت اور تحریک احمدیت۔مفہوم القرآن (تین جلدیں) اور مطالب الفرقان۔قرآنِ کریم کی تفسیر خود قرآن سے (7 جلدیں) اس کے علاوہ ہزارہا صفحات پر پھیلے دیگر مضامین جو طلوعِ اسلام اور دیگر مجلّات کے اوراق کی زینت بنے۔اس شب و روز کی جانفشانی کے ساتھ ساتھ قرآنِ حکیم کے دروس کے دوادوار کا طویل سلسلہ پہلا دور الحمد سے لے کر والناس تک سات سال اور اس کے بعد دوسرا دور الحمد سے لے کر سورۃ مطففین تک 17 سال جاری رہا۔

سورۃ یٰسٓ کا آغاز ذاتِ رسالتمآب حضور نبی اکرم ﷺ کے خطاب سے ہوتا ہے جنہیں شانِ اکملیت میں انسانیت کا آخری سہارا قرار دیا گیا ہے اور اس کی صداقت پر قرآنِ کریم کو بطور شہادت پیش کیا گیا ہے۔علامہ پرویزؒ مرحوم نے اپنی کتاب معراج

انسانیت کے باب صبحِ بہار میں لکھا تھا کہ:

''خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا' شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دئے جانے تھے' وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں''۔

آپ ایک نظر سورۃ یٰسین کے مشمولات اور دروس کو دیکھ لیجئے معلوم ہو جائے گا کہ مندرجہ بالا اقتباس کا سرچشمہ قرآنِ کریم کے یہی مقامات ہیں۔ مختصراً قرآنِ کریم کے نزدیک قرآنی نظامِ حیات کے قیام کے لئے انسان سازی قدمِ اول ہے اس لئے رسولِ اکرم ﷺ کی زندگی بخش تعلیم کا پہلا مرحلہ دلائل و براہین کو سامنے لاتا ہے۔ بینات سے مطمئن ہونے والوں کے لئے دوسرا مرحلہ ضابطۂ قانون کی صداقت کو ماننا اور اس کے بعد تیسرا مرحلہ میزانِ عدل کا قیام اور شمشیرِ خارہ شگاف کا مقام ہے۔۔۔۔۔ تاریخ شاہد ہے کہ انسان کا ہر قدم مکافاتِ عمل کی طرف اٹھ رہا ہے اور دین کی تمام تر بنیاد قانونِ مکافاتِ عمل پر استوار ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کی تمام ثمر باری جہانِ فردا سے متعلق مکافاتِ عمل کے ایمان پر ہے۔ انسانی زندگی ایک ایسی عمارت ہے جو حسنِ عمل کے سہاروں کے بغیر تعمیر نہیں ہو سکتی اور انسانی معاشرہ میں خارجی تبدیلی کا تمام تر دارومدار انسان کی نفسیاتی تبدیلی پر منحصر ہوتا ہے۔۔۔۔۔ دنیا میں وہی نظام قائم رہ سکتا ہے جو پوری نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش ہو۔ دین کی گھاٹی پہاڑ پر چڑھنے کے مترادف ہے اور اس کا پہلا قدم محکوم کے گلے سے غلامی کا طوق اتارنا ہے' دوسرا قدم معاشرہ میں رزق کی فراوانی پیدا کرنا اور تیسرا قدم یہ ہے کہ اس کے نظام میں کوئی شخص اپنے آپ کو تنہا محسوس نہ کرے۔۔۔ حیوانی سطحِ زندگی کے بجائے انسانی سطح پر زندگی گذارنا جنت میں داخلہ کی ضمانت ہے اور وجہ شرفِ انسانیت ہے۔

آئیے قلب ونظر کی بالیدگی کا اہتمام کریں۔

شیخ اللہ دتا
ریٹائرڈ سیکریٹری حکومتِ پنجاب
ایڈووکیٹ ہائی کورٹ' لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ تمنا

یہ نصف صدی کا قصہ ہے
دو چار برس کی بات نہیں

قرآنِ حکیم کی عظمت کے سلسلہ میں سوالات اور جوابات کی ایک یادگار نشست

قارئینِ کرام! آپ یقیناً اس حقیقت سے واقف ہونگے کہ آج سے ربع صدی پیشتر محترم غلام احمد پرویزؒ سال بہ سال ادارہ طلوعِ اسلام لاہور کے زیر اہتمام طلوعِ اسلام کنونشن کا انعقاد کیا کرتے تھے جو سال ہا سال جاری رہا۔ اس موقع پر دیگر موضوعات کے علاوہ آپ کی طرف سے ایک خصوصی نشست مجلسِ استفسارات بھی ترتیب پاتی تھی اور پھر اس محفلِ فکر و نظر کے دوران مختلف قسم کے سوالات زیرِ بحث آتے اور پرویزؒ مرحوم ان کئے گئے سوالات کا جواب نہایت پُر مغز، مدلل، عام فہم اور بعض اوقات ظریفانہ انداز میں کچھ اس طرح پیش کرتے کہ پوری محفل زعفران بن جاتی۔ جبکہ دوسرے ہی لمحہ شریکِ محفل اپنی اپنی علمی سطح کے باعث گہری سوچ میں ڈوبا دکھائی دیتا۔

عزیزانِ من! راقم اس موقع پر عمرِ رفتہ کے گذرے ہوئے حسین لمحات کے سہارے مذکورہ محفلِ استفسارات کا ایک روشن باب قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے جو یقیناً ہم سب کے لئے بالیدگی روح ہوگا۔ جیسا کہ ایک اجتماع میں پرویزؒ صاحب کی خدمت میں ایک صاحب کی طرف سے پوچھا گیا سوال اور موصوف کی طرف سے اس کا جواب حاضرِ خدمت ہے۔

سوال:

''جنابِ پرویزؒ صاحب آپ نے اپنی ساری زندگی قرآنِ حکیم کے ایک ایک لفظ پر غور و فکر کرنے اور پھر اسے علی وجہ البصیرت سمجھنے اور سمجھانے میں بسر کی تو کیا آپؒ بتا سکیں گے کہ قرآنِ حکیم کی وہ

کونسی ایسی آیت ہے جو سب سے زیادہ پرمغز' بلیغ' مؤثر اور اہم ہے''۔

پرویزؒ صاحب کی طرف سے جواب دیا گیا وہ یہ تھا کہ:

''عزیزم! میں آپ سے کیا عرض کروں کہ قرآنِ حکیم کی کونسی آیت بدرجۂ اتم اور پرمعنی ہے۔ فرمایا: اے اللہ کے بندے شہد کا تو ہر ذرہ ہی میٹھا ہوتا ہے کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ شہد کا یہ ذرہ دوسرے ذروں سے کچھ قدرے کم میٹھا یا کم قدر و منزلت کا حامل ہے۔''

قارئینِ کرام! پرویزؒ صاحب کی طرف سے یہ جواب سننے کے بعد حاضرین میں سے شاید ہی کوئی ایسا فرد ہوگا کہ جس کی آنکھیں بے ساختہ پرنم نہ ہوگئی ہوں۔اے کاش! کہ ہم نے قرآنِ حکیم کو اسی انداز سے دیکھا اور سمجھا ہوتا۔

قرآنِ حکیم کو پڑھنے کے سلسلہ میں حافظ اسلم جیراجپوریؒ (محترم پرویزؒ صاحب کے استادِ محترم) کا ایک سبق آموز طریق

قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ **و من اٰیته یریکم البرق خوفًا و طمعًا و ینزل من السمآء مآء فیحی به الارض بعد موتها ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یعقلون** (30:24) یہ تمام نشانیاں ہیں ایک بات سمجھنے کے لیے۔لیکن یہ آیات ان کے لئے ہیں جو عقل وفکر سے کام لے گا۔اور جو کتاب کے الفاظ کے معنی ہی نہیں سمجھے گا تو وہ عقل وفکر سے کام کیا لے گا۔یہ جو قرآن حفظ کیا ہوا ہوتا ہے' یہ جو قرآن کے حافظ ہوتے ہیں' میں نے ان سے یہ کہا کہ آپ تو بڑی آسانی سے اپنی منزل دہرا لیتے ہونگے' وہ روز دو منزل پڑھتے تھے۔وہ میرے استاد علامہ حافظ اسلم جیراجپوریؒ (1879-1955) تھے۔میں نے دیکھا کہ انہیں علی الصبح اٹھ کر ایک منزل دہرانی پڑتی ہے تب وہ حفظ قائم رہتا ہے۔انہوں نے میری بات کا جواب دیا کہ نہیں بھئی' دشواری ہوتی ہے کیونکہ میں جس وقت پڑھتا ہوں میری توجہ قرآن کے مفہوم کی طرف چلی جاتی ہے اور اگلی آیت ذہن سے نکل جاتی ہے۔یہ جو اس طرح سے ایک ایک شیشے میں اتنا پڑھ جاتے ہیں وہ اس لیے ہے کہ وہ ایک لفظ نہیں سمجھتے بلکہ انہوں نے صرف لفظ ہی یاد کئے ہوئے ہوتے ہیں۔یہ جو چیز ہے کہ وہ الفاظ کے مفہوم پہ نگاہ جائے تو وہ جس رفتار سے یہ پڑھ رہے ہوتے ہیں تو وہ گاڑی اُس میں اٹک جاتی ہے لیکن پڑھ جائیں' یا نہ پڑھ جائیں بات تو سوچنے کی ہے کہ کیا دنیا میں کوئی کتاب بھی ایسی ہے جس کے ساتھ یہ کیا جاتا ہے؟ (بحوالہ سورۃ روم صفحہ 81)

قرآن فہمی کے سلسلہ میں مغرب کے سائنسدان ہم مسلمانوں سے زیادہ فعال ثابت ہوئے ہیں

قرآن حکیم نے **لقوم یعقلون** (30:24) کہا ہے۔یہ تو کتاب ایسی ہے جس میں **یتفکرون**' **یتدبرون**'

یشعرون، **یعلمون**، **یعقلون** کہتا ہے۔ سارا قرآن اس سے بھرا ہوا ہے کہ تدبر کرو، فکر کرو، تعقل کرو، غور کرو، بصیرت سے کام لو، علم سے کام لو۔ اگر آپ اس کتاب کے صرف الفاظ دہرائے چلے جائیں تو پہلی چیز تو الفاظ کے معنی کے سمجھنے کی ہوتی ہے اس کے بعد غور و فکر تو بعد کی بات ہے۔

قرآن حکیم نے فرمایا کہ **و من اٰیٰتہ ان تقوم السمآء و الارض بامرہ** (30:25) ارض اور خارجی فضا میں بکھرے ہوئے جس قدر کرے ہیں وہ تمام کے تمام **تقوم بامرہ** ہیں۔ اس کا عام ترجمہ تو یہ ہوگا کہ وہ خدا کے حکم سے قائم ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ جس قرآن نے یہ کہا ہے کہ جو غور و فکر کرنے والی قوم ہے وہ سمجھ سکے گی کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ تو ان چیزوں پہ غور تو ہمارے ہاں مغرب کے سائنسدانوں میں ہو رہا ہے۔ مذہب پرست مسلمانوں کی قوم کے اندر تو اکثریت ان کی ہے جو صرف اس کے الفاظ دہراتے ہیں اور الفاظ کے بھی معنی نہیں سمجھتے۔ جو معنی کی طرف جاتے ہیں ان کی صورت یہ ہے کہ ہزار برس پیشتر کسی شخص نے جو معنی سمجھ لیا ہے آج اسی کے اوپر یہ کھڑے ہیں حالانکہ اس ہزار برس کے اندر انسانی علم کہیں کا کہیں جا پہنچا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہارے انفس و آفاق میں قرآن کے سمجھنے کے لیے آیات ہیں۔ ''انفس'' کو تو چھوڑ دیئے وہ یہ ''آفاق'' کیوں کہتا ہے یعنی خارجی کائنات کے اندر کیوں؟ اس کے لیے تو سائنٹفک طریقہ اختیار کرنا ہوگا، اس سے بات سمجھ میں آئے گی۔'' (سورۃ روم صفحہ 83)

کائناتی وسعتوں کے اسرار و رموز کو جاننے کے سلسلہ میں ہماری ذہنی پستی کی حالت

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو چکی ہوگی کہ خارجی کائنات کو مسخر کرنے کے لئے قوانینِ فطرت (جو کسی انسان کے بنائے ہوئے نہیں) کا علم حاصل کرنا کس قدر ضروری ہے جب کہ کائنات کی وسعت کے متعلق پرویز صاحب کا کہنا یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کا تین چوتھائی حصہ مظاہرِ فطرت کی حقانیت پر مبنی ہے جب کہ کائناتی علم کے سلسلہ میں ہماری حالت زار تو بزبانِ پرویزؒ کچھ اس قسم کی ہے کہ

> ''جب پہلی دفعہ یہ بات ہوئی کہ چاند پہ آدمی جا رہا ہے تو ہمارے ہاں یہاں کئی جلسوں میں یہ وعظ بڑے زور سے ہوئے تھے (وہ حسن اتفاق تھا کہ سوئے اتفاق) کہ وہ چاند رات کے دن تھے جب وہ پہلی دفعہ چاند کے اوپر گئیہ ہیں تو مولوی صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے آج تو وہ چلے جائیں گے کہ چاند کھلا ہوا ہے اور وہ پہنچ بھی جائیں گے لیکن چودھویں کے بعد جب وہ گھٹنا شروع ہوا تو پھر ٹھیک ہے کھسکتے ہوئے آگے آگے چلے جائیں گے اور اس کے بعد کہا ''بچے او! 30-29 نوں کتھے جاؤ گے''۔ (بحوالہ جلد ہذا سورۃ روم صفحہ 93)

قرآن فہمی کے سلسلہ میں محترم پرویزؒ صاحب کی خدمات

عزیزانِ من! قرآن حکیم کی یہی وہ عظمت ہے کہ جس کے پیشِ نظر محترم پرویزؒ نے عمر بھر اپنی زندگی کو قوم کی امانت خیال کرتے ہوئے اس کے ایک ایک لمحہ کو قرآن کی خدمت کے لئے وقف کیے رکھا اور آپؒ کی اس سعی و کاوش کا ثبوت اور ماحصل لغات القرآن، تبویب القرآن، مفہوم القرآن، انسان نے کیا سوچا، معراجِ انسانیت، شاہکارِ رسالت، جیسی پرمغز اور ضخیم 45 کے قریب تحقیقاتی تصانیف اس کی زندہ شہادت ہیں۔

عزیزانِ من! اس جانفشانی کے علاوہ 17 سال کے طویل عرصہ کے دوران 700 کے قریب ہفتہ واری دروس آڈیو اور ویڈیو کی شکل میں محفوظ کروا دئے گئے لیکن جناب پرویزؒ مرحوم کے ہی الفاظ میں اس کا کیا علاج کہ ''ملا ہمیں کافر کہتا ہے اور کافر ہمیں ملا''۔ جب کہ حقیقت تو یہ ہے کہ بقول شاعر

قضا کس کو نہیں آتی ہے یوں تو سب ہی مرتے ہیں
پَر؟ اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

پرویزؒ صاحب کے دروس کو قرطاس پر منتقل کرنے کی سعی و کاوش

عزیزانِ من! جہاں تک پرویزؒ صاحب کے (دوسرے دور کے) مذکورہ دروسِ قرآن کا تعلق ہے۔ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور انہیں ایک عرصہ سے سی ڈی سے کمپوز کرتے ہوئے قرطاس پر منتقل کرنے میں مصروفِ کار ہے اور خیال ہے کہ قرآنِ حکیم کی مکمل تفسیر بزبان پرویزؒ 45 جلدوں میں مکمل ہو سکے گی جب کہ اس سے پیشتر ان دروسِ قرآن کی 16 جلدیں ''مطالب القرآن فی دروس الفرقان'' کے عنوان کے تحت قارئین کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہیں۔ علاوہ ازیں جہاں تک جلد ہذا کا تعلق ہے تو یہ جلد سورۃ روم -30، سورۃ لقمان-31 اور سورۃ سجدہ-32، پر مشتمل ہے۔

سورۃ روم کے شروع میں روم کی مملکتوں کا ذکر اور ان کا تاریخی پس منظر ''ایرانی، بازنطینی حکومتوں کی 602ء یا 612ء یا 614ء تک جنگ و جدل کی روائیداد کے علاوہ قرآنِ حکیم کے نزدیک معاشرتی طور پر اہل کتاب اور مشرکین کے پائے جانے والے فرق کی نوعیت کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ نیز مذکورہ تینوں سورتوں میں جا بجا قرآن حکیم کے معاشی نظام کی وضاحت کرتے ہوئے ربٰو کے بل بوتے پر صدیوں سے قائم نظام سرمایہ داری کی بیخ کنی کرتے ہوئے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انسان کی سب سے زیادہ ذلت اور رسوائی معیشت کی بنا پر ہی ہوتی ہے۔ کیا کتے کو نکالے بغیر کنویں سے بو کے (ڈول) نکالتے رہنے سے کنویں کا پانی پاک ہو سکتا ہے؟

سورۃ روم، سورۃ لقمان اور سورۃ سجدہ کے دروس کا ماحصل

عزیزانِ من! اگر یہ دیکھنا ہو تو کہ محترم پرویزؒ صاحب نے زیرِ نظر تین سورتوں یعنی سورۃ روم، سورۃ لقمان، اور سورۃ سجدہ

میں کس کس قسم کے قرآنی حقائق کی روشنی میں کس کس انداز سے انسان کی نفسیاتی بیماریوں کی نشاندہی کی ہے اور اس کا کس قدر شافی علاج تجویز کیا ہے' تو ہمارا خیال ہے کہ قارئین اس چیز کا اندازہ مذکورہ سورتوں کی فہرست میں دئے گئے عنوانات یا مشمولات جن کی تعداد تقریباً 500 کے قریب ہے' سے بخوبی لگا سکیں گے۔

عزیزانِ من! ذوقِ جمالیات سے سرشار زندگی بندۂ مومن کی میراث ہے اور قرآن حکیم کی دَفَتین کے ایک ایک ورق پر ذوقِ جمالیات کے مناظر بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔ لہٰذا جو ضابطۂ حیات نوعِ انسانی کی حد تک اپنے اندر سدا بہار پھولوں کی مہک لئے ہوئے ہو' اس سے مایوسی کیسی اور کیوں!!!!

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

علامہ اقبالؒ کے ہی الفاظ میں یہ سامان قرآنِ کریم کا ہی پیش کردہ ضابطۂ حیات ہے جس کی اہمیت کے پیشِ نظر اس نے کہا تھا کہ

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

آخر پر حسبِ سابقہ ہم فکرِ قرآنی کی محسن شخصیت جناب ڈاکٹر منظور الحق صاحب کی علمی کاوش اور محترم محمد علی فارق صاحب کے ادبی تعاون کے علاوہ جناب محمد ہارون ریاض صاحب اور جناب رشید احمد صدیقی صاحب کے مشکور ہیں جنہوں نے کتاب ہذا کی کمپوزنگ کے سلسلہ میں اپنی خدمات پیش کیں۔

محمد اشرف ظفر
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور
مئی 2009ء

ایک عظیم قرآنی خزانہ

قرآن مجید پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے خوشخبری

مفکرِ قرآنِ مجید علامہ پرویزؒ صاحب کی زندگی بھر کی قرآنی بصیرت کو DVD پر دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔

قیمت 20 کراؤن فی سی۔ڈی علاوہ ڈاک خرچ میں طلب کیجئے۔

☆ بیرون ملک **bazmdenmark@gmail.com**

سی ڈی اور کتب کی خریداری ☆ اندرون ملک' فون: **+92 42 5753666**' ای میل: **trust@toluislam.com**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد علی صابر صدیقی، پشاور

اقبالؒ کے فلسفہ خودی کے ارتقاء سے متعلق ایک تصور

علامہ اقبال کے فلسفہ میں خودی کا تصور بنیادی اور کلیدی حیثیت رکھتا ہے جس کے سہارے ان کے نظام فلسفہ کی پرشکوہ عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہی وہ نسخہ کیمیا ہے جو مس خام کو کندن، پتھر کو پارس اور مٹی کے پتلے کو انسان بنا دیتا ہے۔ اس فلسفہ کے عناصر میں ایک عنصر کا نام ارتقا ہے جس پر اگر مثبت انداز میں غور کیا جائے تو انسان کو یوم آخرت اور حیات بعد الممات پر یقین کرنا پڑتا ہے جس یقین کے بغیر خودی کی نشوونما کی ہر کوشش نقش برآب ثابت ہوتی ہے۔ اس خیال کے ماتحت لسان العصر جناب اکبر الہ آبادی نے کہا تھا کہ

حدیث عقبیٰ اگر غلط ہے تو کیا نتیجہ ہے ارتقا کا

فلسفہ پر بات کرتے ہوئے ہم سب سے پہلے افلاطون کی طرف دیکھتے ہیں جو کہتا ہے کہ وہ کائنات جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اپنا کوئی حقیقی وجود نہیں رکھتی۔ یہاں انسان سمیت ہر چیز اعتباری ہے۔ یہ تصور ''خودی'' کی نفی کر دیتا ہے لیکن دل کی گہرائیوں سے ''میں'' کہنے والا ہی اس ریوڑ کی بھیڑ چال سے نکل سکتا ہے جس ریوڑ کا سرخیل افلاطون تھا۔ دل کی گہرائیوں سے اس لئے کہا ہے کہ ''میں'' تو بکری بھی کہتی ہے۔ بکری کی طرح میں کہنے والا ایک نہیں ہماری پوری قوم اسی تصور کے سایہ میں پروان چڑھتی ہے۔ میر تقی میر مرحوم نے کہا کہ

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

مرزا غالب کیوں پیچھے رہتے۔ انہوں نے بھی اعلان کر دیا کہ

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اپنے بیان کو مزید محکم کرنے کے لئے فرمایا کہ

مت کھائیو تم فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

یہ بات میر صاحب یا غالب تک محدود نہ تھی۔ دنیا بھر کے فلاسفہ ایسے ہی بے پر کی اڑا رہے تھے کہ یورپ کے ایک فلسفی کو اس قسم کے مروجہ خیالات کی صحت پر کچھ شک گزرا۔ لیکن بات کچھ بن نہیں رہی تھی افلاطونی جال سے نکلنا آسان نہ تھا۔ اگر افلاطون کو بغیر سوچے سمجھے ہم قبول کر لیں تو ایسی خوشی محسوس ہوتی ہے جیسی بچے کو ایک جھنجھنا پا کر ہوتی ہے کہ اسے بجاتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ اسی جھنجھنے کی آواز جب یورپ میں گونجی تو ایک ملکہ نے

ایک متشکک فلسفی کو دعوت دی کہ وہ اسے آ کر فلسفہ پڑھائے جو قبول کر لی گئی۔ فلسفہ کے دروس چلتے رہے اور فلسفی یہ سوچتا رہا کہ وہ خود کو بھی دھوکا دے رہا ہے اور لوگوں کو بھی اپنی گمراہی میں شریک کر رہا ہے۔ یورپ میں سردی بہت ہوتی ہے فلسفی کی خدمت پر مامور خدمت گزار ایک رات آتشدان میں ایندھن کی پوری مقدار ڈالنا بھول گیا۔ آگ وقت سے پہلے ہی جواب دے گئی اور فلسفی صاحب مارے سردی کے ٹھٹھرنے لگے۔ سردی کی ناقابل برداشت شدت نے جب فلسفی کو حواس باختہ کر دیا تو وہ بستر سے نکل کر آتشدان میں جا بیٹھا۔ جب آتشدان کی حرارت سے فلسفی کا جسم گرم ہونا شروع ہوا تو اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ جوں جوں اس کا جسم گرم ہوا اس کے فلسفہ میں بھی حرارت پیدا ہونی شروع ہوگئی۔ اس نے سوچا کہ کائنات واہمہ ہے آتشدان کی حرارت دھوکا ہے لیکن وہ کون ہے جسے پہلے سردی لگ رہی تھی اور اب کس کو گرمی لگ رہی ہے۔ وہ کون تھا جو کہتا ہے کہ کائنات ایک واہمہ ہے مانا کہ کائنات واہمہ ہے لیکن اسے واہمہ کہنے والا تو اپنا وجود رکھتا ہے۔ اس فلسفی کا نام ڈیکارٹ ہے جو فلسفہ جدید کا بانی کہلاتا ہے۔ اس قسم کے خیالات ہر سوچنے والے کو پریشان کرتے ہیں اور علامہ اقبال پر جب یہ دور گزرا تو کہا۔

اگر گوئی کہ ''من'' وہم و گمان است
وجودش چوں وجود این وآں است
بگو بامن کہ دارائے گماں کیست
یکے درخود نگر آں بے نشاں کیست

علامہ اقبال مدت تک سوچتے رہے کہ آں دارائے گماں کیست آخر گوہر مراد مل گیا اور وہ کیف و مستی میں چلا اٹھے۔

صورت نہ پرستم من بتخانہ شکستم من
آں سیل سبک سیرم ہر بند گسستم من
دربود و نبود من اندیشہ گماں ہاداشت
از عشق ہویداشد ایں نکتہ کہ ہستم من

ڈیکارٹ کی طرح علامہ اقبال بھی سوچ رہے تھے کہ مان لیا کہ کائنات و مافیھا سب واہمہ ہے تو کم از کم میری ہستی تو واہمہ نہیں ہوسکتی۔ اگر میری ہستی واہمہ ہوتی تو پھر کون کہتا کہ کائنات ایک واہمہ ہے لہٰذا میں تو موجود ہوں اور مجھے ''میں'' کہنے کا حق ہے۔

☆☆☆

لاہور میں موسم بہار کی آمد آمد تھی۔ گرمی خبر دے رہی تھی کہ لاہور کی گلیوں میں جلد ہی دھول اڑنے والی ہے۔ آج شاید علامہ اقبال کی گگ مرمت کے لئے بھیج دی گئی تھی یا گھوڑا بیمار تھا۔ کچھ تو تھا کہ علامہ ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے ہائی کورٹ کی عمارت سے نکلے اور پیدل اس گلی کی طرف آئے جو مال روڈ کو میکلوڈ روڈ سے ملاتی ہے اور جہاں رینکن کی درزی کی دکان تھی۔ علامہ جونہی میکلوڈ روڈ پر پہنچے تو سڑک پر پڑے ہوئے ایک چمکدار ذرے نے اپنی ایک شعاع سے علامہ کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ چکاچوند کی وجہ سے علامہ کی چال کا توازن بگڑا تو ایک روڑے سے ٹھوکر کھا کر علامہ لڑکھڑائے۔ روڑے نے کہا حضور ہم بھی تو پڑے ہیں

راہوں میں۔علامہ سوچ میں ڈوبے ہوئے خیال کر رہے تھے کہ یہاں کائنات کا ہر ذرہ اپنی موجودگی کا اعلان کر رہا ہے اور ہر طرف سے ''میں'' کی آواز آ رہی ہے۔

اسی سوچ میں غرق علامہ گھر پہنچے' کپڑے اتارے' بنیان پہنی' تہمد باندھا اور ایک کھرّی چارپائی پر بکائن کے درخت کے نیچے لیٹ گئے۔عمل تدشیر شروع ہو چکا تھا بکائن کے درخت پر نئی نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔علامہ ٹکٹکی باندھے درخت پر بہار کی آمد کا نظارہ کر رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ ایک ٹہنی پر پھڑک کر ایک کونپل شاخ کو توڑتے ہوئے باہر نکل آئی۔حیران کن بات تھی ایک ننھی سی کونپل شاخ کی سخت لکڑی کو کیسے توڑ سکتی ہے۔اسی قسم کی حیرت مولانائے روم کو بھی ہوئی تھی جن کا یہ شعر علامہ کے ذہن میں ابھرا:

اے برگ قوت یافتی تا شاخ رابشگافتی
چوں رستی از زندان بگوتا من دریں حبس آں کنم

حیرت میں ڈوبے ہوئے علامہ اقبال کا ذہن تخیلات کی دنیا میں گم زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو کر بکائن کے تنے کی انابیب شعری کے نظارے میں محو ہو گیا جہاں چھوٹے چھوٹے خلیے ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر تنے کے مرکز سے محیط کی طرف آنے کی کوشش کر رہے تھے۔علامہ کو احساس ہوا کہ ان میں کچھ خلئے جلد بازی میں فساد کی حد کو چھو کر اپنے آپ کو زخمی کر لیتے ہیں اور اس قابل نہیں رہتے کہ محیط تک پہنچ سکیں اور کچھ جو محیط تک پہنچ جاتے ہیں ان میں اتنی سکت نہیں رہتی کہ شاخ کی سخت بیرونی لکڑی کو توڑ سکیں۔علامہ کا ذہن فوراً انسانی معاشرے کی طرف منتقل ہو گیا کہ اس دنیا میں فساد دراصل اخروی سزا کا موجب بنتا ہے اور امن و سکون کی زندگی انسان کو اس قابل بنا دے گی کہ وہ دوسری دنیا میں اسی طرح داخل ہو گا جیسے ایک سرسبز پتی شاخ کو توڑ کر ہوا میں لہرانے لگتی ہے۔علامہ بکائن کی کونپل کی خودنمائی سے سرشار اپنے کبوتروں کی دیکھ بھال کے لئے مکان کی چھت پر چلے گئے۔معمول کے مطابق وہ انہیں دانہ دنکا کھلانے میں مصروف تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ چھت کی منڈیر پر کچھ دانے اپنے آپ کو کونپل میں تبدیل کر کے مٹی کے جیل خانے سے باہر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔علامہ نے تو پہلے ہی بکائن کی کونپل کو دیکھ کر کیف و مستی سے سرشار تھے' فوراً چلا اٹھے۔

ہر شاخ سے یہ نکتہ پیچیدہ ہے پیدا
پودوں کو بھی احساس ہے پہنائے فضا کا
ظلمت کدۂ خاک پہ شاکر نہیں رہتا
ہر لحظہ ہے دانے کو جنوں نشوونما کا

علامہ اقبال اپنے فلسفیانہ خیالات میں گم آس پاس سے بے خبر اپنے محبوب ترین کبوتر کو ہاتھ میں لئے اسے پیار کر رہے تھے کہ آسماں کی بلند پہنائیوں سے برق رفتاری سے ایک شاہین نے غوطہ لگایا اور جھپٹ کر علامہ کے ہاتھ سے کبوتر کو چھین کر فضاؤں میں گم ہو گیا۔شاہین کبوتر کو لے کر فضاؤں میں گم تو ہو گیا لیکن وہ علامہ کی فلسفیانہ گتھیوں کو سلجھا کر ان کے فلسفہ کو مکمل کر گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر طاہر انیس

نقد ونظر

پچھلے دنوں ایک کتابچہ ''سبیل المومنین (فکر پرویز کا ایک جائزہ)'' کے نام سے ادارہ صوت القرآن لاہور کی طرف سے مارکیٹ کیا گیا ہے' جس کے مؤلف ملک احسان الحق صاحب ہیں۔ اس کتابچہ میں افسوس ہے کہ ''فکرِ پرویز کا ایک جائزہ'' لیتے وقت مصنف نے اعتدال و انصاف کا دامن جا بجا تار تار کر دیا ہوا ہے۔ پس فکر پرویز کے ضمن میں موصوف کی بے جا تنقید اور 'بغضِ معاویہ' کا ریکارڈ درست رکھنے کے لئے یہ مضمون تحریر کرنا ضروری معلوم ہوا کیونکہ ؎

شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور

یہ کتاب 152 صفحات پر مشتمل ہے۔ فہرست مضامین میں 75 مختصر ابواب قائم کئے گئے ہیں۔ مگر کتاب کے متن میں ان 75 موضوعات کو کسی درجہ کی گہرائی و گیرائی میں زیرِ بحث لانے کی بجائے صرف سرسری' یکطرفہ اور ادھورے تبصرے کئے گئے ہیں جس کی وجہ سے کسی ایک موضوع پر بھی سیر حاصل بحث نہیں ہوسکی۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہر موضوع کو تشنہ چھوڑ دینے کے باوجود کتاب کے تقریباً ہر صفحہ پر پرویز مرحوم کے خلاف طنزیہ اور اِستہزائیہ انداز اختیار کیا گیا ہے جو کسی بھی سنجیدہ اور متین تحریر کے لئے قابلِ فخر نہیں ہوسکتا۔ اس کتاب کے مطالعہ پر ہر وہ قاری جس کے ذہن میں پہلے سے ہی پرویز صاحب کے بارے میں تعصب نہ ہو اور جس کی کسی معقول درجہ میں محترم پرویز کی بے شمار تحریروں اور تقریروں پر نظر ہو' اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ محترم مؤلف نے پرویز صاحب کا نہایت سرسری اور سطحی مطالعہ کیا ہے اور ان کا موقف پوری طرح سمجھے بغیر محض سنی سنائی باتوں پر ہی کان دھرا ہے۔

یوں تو اس کتاب کے مطالعہ پر ایک سنجیدہ قاری کے ذہن میں بہت سے سوالات ابھرتے ہیں تاہم اختصار کی خاطر ہم اس مضمون میں اپنے اعتراضات کو صرف مندرجہ ذیل نکات تک ہی محدود رکھیں گے:۔

1- ''پہلی غلطی'' کے زیرعنوان صفحہ II پر تحریر ہے:

''دوسری طرف آج کا جدید روشن خیال طبقہ اہلِ قرآن کے پرکشش نام سے اٹھا۔ اس نے کتب روایات اور تمام فقہی ائمہ سے بیزاری اختیار کرتے کرتے اپنے دین کے ماخذ سے رسول اللہ کو بھی نکال باہر کیا۔ روایات و فقہ کا انکار کرتے

کرتے اتباعِ عملِ رسول کا بھی انکار کر بیٹھے اور اس طرح یہ بات بھول گئے کہ وفیکم رسولہ کا مطلب تصریف آیات کے مطابق یہ بات لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ہی کے معنیٰ میں ہے۔''

'پہلی غلطی' تو اس اقتباس میں محترم پرویز کو 'اہل قرآن' میں شامل کرنا ہی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر فیکم رسولہ کا مطلب اسوۃ حسنہ کے معنی میں ہے تو بھی سوال یہ ہے کہ یہ اسوۂ حسنہ ہمیں کہاں سے دستیاب ہوتا ہے جس کی پیروی ہم پر فرض ہے۔ ''اسوۂ حسنہ'' کا مطلب یہ نہیں کہ رسالتمآب کیا پہنتے تھے اور کیا کھاتے تھے۔ سو فیصد مصدقہ (Certified) اسوۂ حسنہ ہمارے لئے خود قرآن کریم کے اندر ہی محفوظ کر دیا گیا ہے مثلاً اخلاق کی بات کی جائے تو ''اور آپ کے اخلاق بڑے عالی ہیں۔'' (68:4) اور ''اللہ کی مہربانی سے آپ کی افتادِ مزاج ان لوگوں کے لئے نرم واقع ہوئی ہے۔'' (3:159)۔ ہمدردی اور شفقت ایسی کہ ''تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے' تمہاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں اور مومنوں پر نہایت شفیق اور مہربان ہیں۔'' (9:128)۔ تنظیم سازی ایسی کہ ''اور جب آپ صبح سویرے جنگ کے لئے گھر سے نکل پڑے اور مومنوں کو لڑائی کے لئے مورچوں پر (موقع بموقع) اپنی نگرانی میں متعین کر رہے تھے۔'' (3:121)۔ بہادری اور شجاعت ایسی کہ ''جب تم (جنگ کے دوران) دور بھاگے جاتے تھے اور کسی کو پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے مگر رسول اللہ تمہارے پیچھے ڈٹے ہوئے تم کو واپس (میدانِ جنگ میں) بلا رہے تھے۔'' (3:153)۔ انصاف و عدل ایسا مثالی کہ یہودی بھی اپنے تنازعات کے فیصلے آپ ﷺ سے کرانے کو ترجیح دیتے تھے ''اور یہ آپ سے (اپنے مقدمات) کے لئے فیصل کرائیں گے جب کہ خود ان کے پاس تورات موجود ہے۔'' (5:43)۔ یہ اور اس قسم کے اسوۂ حسنہ کی اور بھی کئی مثالیں خود قرآن کریم میں موجود ہیں' اس لئے حقیقی اسوۂ حسنہ (جس کی اتباع کے ہم مکلّف ہیں) کے لئے ہم قرآن سے باہر جانے کے محتاج نہیں ہیں۔ مزید برآں' یہ بھی ذہن نشین رہے کہ قرآن کریم میں اسوۂ حسنہ صرف رسالتمآب ﷺ ہی کا نہیں بلکہ کئی انبیاء کا موجود ہے مثلاً یوسفؑ کی عفت و عصمت ''یوسفؑ نے کہا کہ پروردگار جس کام کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں' اس کی نسبت مجھے قید زیادہ پسند ہوگی۔'' (12:33)۔ ابراہیمؑ کی شرک سے بیزاری ''تمہارے لئے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں (کی پیروی کے لئے ان) کا اسوۂ حسنہ موجود ہے (اور وہ یہ ہے کہ) جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم تم سے اور ان چیزوں سے جن کو تم اللہ کے علاوہ پوجتے ہو بیزار ہیں' اور جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ' ہم تم میں ہمیشہ کھلم کھلا طور پر عداوت اور دشمنی رہے گی۔'' (60:4)۔ ابراہیمؑ نہایت سچے بھی تھے ''اور کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو بے شک وہ نہایت سچے نبی تھے۔'' (19:41)۔ یعنی انہوں نے تین

چھوڑا ایک جھوٹ بھی نہیں بولا تھا جیسا کہ روایات میں درج ہے)۔ اسماعیلؑ جو وعدہ کرتے تھے اسے لازماً پورا کرتے تھے (19:54)۔ وعلیٰ ھذا القیاس۔

2- مصنف کتاب مذکورہ صفحہ 31 پر آیت 10:39 پیش کرتے ہیں کہ:

''اسی ذہنیت کی وجہ سے جس چیز پر ان کا علم احاطہ نہ کر سکا یعنی وہ خود اپنے علم سے اسے سمجھ نہ سکے' اس کا انکار کر دیتے ہیں اور حقیقت کے واضح ہونے تک کا انتظار بھی نہیں کرتے۔'' اس کے بعد فرماتے ہیں ''میرا خیال ہے کہ آج جو رویہ قرآن مجید کے ساتھ اہل قرآن کا ہے درج بالا آیات اس کی صحیح عکاسی کرتی ہیں۔ اس کی سب سے واضح مثال حضرت عیسیٰؑ کی بن باپ پیدائش ہے جس کا ان حضرات نے اپنی من مانی تاویلوں کے ذریعے انکار کیا' لیکن اب کلوننگ کی ٹیکنالوجی نے نہ صرف حقیقت کو واضح کر دیا ہے بلکہ ان کے ''علم'' کا بھانڈا بھی پھوڑ دیا ہے۔ لیکن ان کا رویہ آج بھی وہی ہے۔ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد''۔

مندرجہ بالا اقتباس پر پہلا اعتراض تو وہی ہے یعنی پرویز صاحب کو اہل قرآن میں شمار کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ دوسری بات یہ کہ علم و یقین کی سطح سب زمانوں اور سب لوگوں کے لئے ایک جیسی نہیں ہوتی۔ کائنات اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور قرآن اسی اللہ کا کلام۔ اس لئے کام اور کلام میں کوئی بھی تضاد نہیں ہوسکتا۔ کائنات کے مشاہدے پر جتنا زور قرآن کریم نے دیا ہے وہ محترم مؤلف کو معلوم ہے اور مشاہدہ ہی تمام سائینس کی بنیاد ہے۔ قرآن کو مشاہدہ کی رو سے سمجھا جائے گا ورنہ سمجھنے میں غلطی کا امکان رہے گا۔ مثال کے طور پر آیات 15:19 اور 50:7 کا ترجمہ ہر جگہ یہ ملے گا کہ ''اور زمین کو ہم نے ہی پھیلا دیا۔'' ان الفاظ سے کرۂ ارض کے چپٹے (Flat) ہونے کا تصور آج بھی مذہبی حلقوں میں موجود ہے جو زمین کو گول کہنے کے سخت خلاف ہیں۔ مگر مشاہدہ کو پیشِ نظر رکھ کر اس آیت کو سمجھیں تو درست مفہوم یہ بنتا ہے کہ ''کرۂ ارض (گول ہونے کے باوجود) تمہیں چپٹا (Flat) نظر آتا ہے (تاکہ تم روزمرہ کام کاج بآسانی کرتے رہو) یہ حکیمانہ انداز اس لئے اختیار کیا کہ ایک تو جس چیز پر قرآن کریم زور اور توجہ دلاتا ہے (یعنی زندگی گزارنے کی آسانی)' زمین کو گول کہنے سے وہ پہلو غائب ہو جاتا بلکہ الٹا چودہ صدی پہلے کے لوگ زمین کے گول ہونے کا مطلب سمجھ ہی نہ سکتے اور صرف پریشان (Confuse) ہو کر رہ جاتے کیونکہ ان کی علمی سطح کے مطابق زمین چپٹی تھی' گول ہرگز نہ تھی (اگرچہ اس وقت بھی دراصل گول ہی تھی) تخلیق مسیح کے حساس موضوع کو فاضل مؤلف جان بوجھ کر استحصالی فائدہ اٹھانے کے لئے درمیان میں لے آئے ہیں کیونکہ پہلے ہی لوگوں کے بہت

کثیر حصے کا اس مسئلہ پر ایک جذباتی موقف ہے۔ چنانچہ اوپر دیئے گئے اقتباس میں ارشاد ہوتا ہے کہ ''کلوننگ کی ٹیکنالوجی نے نہ صرف حقیقت کو واضح کر دیا ہے بلکہ ان کے ''علم'' کا بھانڈا بھی پھوڑ دیا ہے۔'' معلوم ہوتا ہے کہ محترم مولف کو پتہ ہی نہیں کہ کلوننگ کیا ہوتی ہے اور کیسے ہوتی ہے ورنہ وہ کبھی بھی سیدنا مسیحؑ کو نعوذ باللہ ایک کلون' قرار نہ دیتے! کلون محض ایک ایضاً (Ditto) کاربن کاپی ہوتا ہے جس کی اپنی علیحدہ کوئی شناخت' شخصیت اور ذات نہیں ہو سکتی۔ تو کیا آپؑ جنابہ مریم صدیقہ کے نعوذ باللہ کلون تھے؟ حالانکہ ایک عورت کا کلون ایک مرد نہیں ہوسکتا کیونکہ کلون کے کروموسوم اور جینیاتی سسٹم نہیں بدلتے۔ عام پیدائش میں یہ کروموسومز اور جینز مرد اور عورت کے ملاپ سے بننے والے بچوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں اور اسی سے Variety اور ہر فرد کی ایک علیحدہ شخصیت بنتی ہے۔ جس طرح ہماری پیدائش ہوتی ہے وہی باعزت طریقہ ہے جو ہمیں علیحدہ شخصیت عطا کرتا ہے اور کلون ہونا بے شخصیت ہونے کے مترادف ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ سیدنا مسیحؑ بن باپ پیدا ہوئے یا نہیں تو اگر ذہن کی سلیٹ پہلے صاف کر کے خالص قرآنی آیات کی بات کریں تو آپؑ کے بن باپ ہونے کی تردید ملے گی۔ بن باپ پیدائش تو عیسائیت میں بھی بہت بعد کی پیداوار ہے جیسا کہ ہر دین بعد میں مذہب میں محرف ہوجاتا رہا ہے۔ یہ عقیدہ داخل کرنے کا مقصد عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا بنانا تھا۔ خصوصاً سینٹ پال نے حقیقی عیسائیت میں ابن اللہ (Son of God) (72:3, 112:3, 6;101)' کفارہ (Atonement) (4:159)' حلول (Divinity) (5:72, 5:17) اور تثلیث (Trinity) (5:73) کے چار غلط عقیدے داخل کر کے اصل دینِ عیسیٰؑ کو بالکل مسخ کر دیا۔ مسلمانوں میں بھی یہ عقیدہ کرسچئن لٹریچر سے آیا ہے۔ راقم نے مؤلف کے ایک لیکچر کے جواب میں عیسیٰؑ کی باباپ پیدائش کے متعلق بائیس (22) نکات ماہنامہ بلاغ القرآن کے شمارہ جنوری 2007ء کے صفحات 7 تا 15 میں دیئے تھے جن کا تاحال کوئی جواب نہیں آیا۔

3- صفحہ 33 پر ارشاد ہے کہ:

''تشریح بالرسول کا مطلب ہے جن آیات کی تشریح رسول نے اپنے عمل سے کی مثلاً اذان کا تعین اور الفاظ۔ صلوٰۃ کی تفصیلات' اوقات' رکعات اور ترتیب وغیرہ۔''

ہمارا سوال یہ ہے کہ اول تو تشریح بالرسول' کوئی قرآنی اصطلاح ہے ہی نہیں۔ بہرحال اگر مفہوماً ہو بھی تو مؤلف یہ بتائیں کہ ''اذان کا تعین اور الفاظ'' کون سی آیاتِ قرآنی کی تشریح ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ رسول بھی صرف دو طرح سے شریعت کی تفصیل متعین کرسکتا ہے۔ اول یہ کہ اس کے متعلق کچھ ایسے لطیف اشارات و نکات خود قرآن کریم کے اندر موجود ہوں جو اگرچہ ایک عام آدمی کو نظر نہ آئیں مگر

معاملہ فہمی کے اعتبار سے رسول کو نظر آ رہے تھے۔ مطلب یہ کہ رسول بھی یہ بات اپنی طرف سے نہیں دے رہا ہوتا بلکہ إِنْ أَتَّبِعُ إِلاَّ مَا يُوحَى إِلَيَّ (10:15) کے مطابق اس قسم کی تشریح ''بِـمَـا أَرَاكَ اللّـهُ'' (4:105) کے ذیل میں آ رہی ہوتی ہے یعنی جو اللہ آپ کو دکھا دے' سمجھا دے۔ دوسرا طریقہ تفصیل دینے کا مشاورت کا ہے یعنی روزمرہ کی ضروریات کے لئے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے کوئی طریق کار وضع کر لینا۔ یاد رہے کہ یہ مشاورت کا حکم بھی خود قرآن کریم کے اندر ہی موجود ہے (42:38, 3:159) اور ظاہر ہے کہ رسول اس پر بھی عمل کرتے تھے۔ چنانچہ یہ ثابت ہے کہ اذان کا طریقہ اور الفاظ رسول کریم نے اس دوسرے طریقے یعنی آپس کے مشورہ سے وضع کئے تھے اور اس کے لئے مروجہ اذان کے ساتھ ساتھ منادی کرنا' ڈھول پیٹنا' ناقوس بجانا وغیرہ کے متبادل طریقے بھی اصحابِ رسول کے درمیان زیر بحث رہے تھے اور ان تمام طریقوں میں مروجہ اذان کو ترجیح دی گئی تھی۔ انہی دو طریقوں کا ذکر 16:44 میں اس طرح آیا ہے ''تاکہ جو (ارشاداتِ الٰہی) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر آپ ظاہر کر دیں اور (دوسرے یہ کہ) وہ خود بھی غور و فکر سے کام لیتے رہیں۔''

4- صفحہ 41 پر تحریر ہے:

''مجھے حیرت ہوئی ہے اور دکھ بھی ہوتا ہے جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی نفی کرتے ہوئے اطاعتِ رسول کو اطاعتِ رب میں ضم کر دیتے ہیں اور اطیعو اللہ واطیعوا الرسول کو صرف اطیعو اللہ تک محدود کر دیتے ہیں اور اس مقصد کو ثابت کرنے کے لئے زمین آسمان کے قلابے ملا دینے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ دونوں اطاعتیں اگر ایک اطاعت کی صورت میں ہی پیش کرنی ہیں تو قرآن سے مجموعی رہنمائی تو یہ ظاہر کرتی ہے کہ اطیعواللہ واطیعوالرسول کو ضم کر کے اطیعوالرسول تو ہو سکتا ہے یعنی اللہ کی مرضی رسول کی مرضی کی شکل میں سامنے آتی ہے (4:80) اس کے برعکس جو لوگ اطیعوالرسول کو صرف اطیعواللہ کے معنی پہناتے ہیں کیا وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے اطیعواللہ اور اطیعوالرسول کے الفاظ الگ الگ کیوں استعمال کئے ہیں۔ اگر صرف اطیعواللہ ہی کہہ دیا جاتا تو معاملہ ویسے ہی بالکل صاف تھا لیکن اطیعوالرسول ایک علیحدہ حکم ہے۔ اس کا مطلب اطاعتِ رسول ہی ہے اور اطیعواللہ سے مراد کتاب اللہ کی اطاعت ہے دراصل ان لوگوں کی اپنی فکر میں الجھاؤ ہے اور الجھاؤ اس وجہ سے ہے کہ انہیں یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ رسول کی زندگی میں تو اطاعت ہو سکتی ہے اور وہ اس کے قائل بھی ہیں لیکن رسول کی وفات کے بعد

اس کی اطاعت کس طرح ہوگی' یہ بات ان کی سمجھ سے بالا ہے۔''

اس اقتباس کے بارے ہم یہی عرض کریں گے کہ ؎

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

یہ سب پرویز مرحوم کا موقف درست طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ اقتباس کا فقرہ ''اللہ کی مرضی رسول کی مرضی کی شکل میں سامنے آتی ہے۔'' یہ مفروضہ غلط ہے کیونکہ رسول کی کوئی مرضی الگ سے نہیں ہوتی۔ اصل اطاعت اللہ ہی کی ہے (6:57 ,18:26 وغیرہ) رسول خود پابندِ اطاعتِ الٰہی ہوتا ہے 4:150 کے مطابق اللہ اور اس کے پیغمبروں کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھنا چاہئے۔ رسول کی اطاعت اس لئے ہے کہ رسول ہی بتا سکتا ہے کہ اللہ نے کیا کہا اور چاہا۔ 4:64 میں الفاظ آئے **إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ** یعنی رسول کی اطاعت اصل اور حقیقی نہیں بلکہ باذن اللہ سے محدود و مشروط ہے۔

''عملِ رسول'' کے بارے میں بھی محترم مؤلف کا ذہن واضح نہیں معلوم ہوتا۔ عمل رسول کو صرف عبادات تک محدود کر دینا ان کی غلطی ہے۔ ظاہر ہے عمل رسول میں آج کل کے روزمرہ مسائل آ ہی نہیں سکتے۔ عملِ رسول ہمیں نہیں بتا سکتا کہ (مثلاً) ٹیسٹ ٹیوب بے بی' کلوننگ' بلڈ ٹرانسفیوژن' آرگن ٹرانسپلانٹ سرجری' فیملی پلاننگ کے جدید طریقے' گرافٹنگ' مصنوعی تولیدی ذرائع اختیار کرنے درست ہیں یا غلط کیونکہ ایسے مسائل دورِ نبوت میں تھے ہی نہیں۔ عمل رسول ہمیں یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ ایسے جانور جن کا اہل عرب کو اس وقت علم ہی نہ تھا مثلاً روس کا رینڈیئر' آسٹریلیا کا کنگرو یا تبت کا لاما کھائے جا سکتے ہیں یا نہیں' وعلی ھذا القیاس' روزمرہ کے نت نئے پیدا ہونے والے مسائل قرآن کریم کی روشنی میں ایک زندہ اتھارٹی بذریعہ مشورہ و اجتہاد (42:38 ,3:159) ہی حل کر سکتی ہے۔ بدقسمتی سے صدیوں سے فکر و اجتہاد کا باب بند کر کے امت کو جمود کا شکار اور تحریک اور حیاتِ نو سے محروم کر دیا گیا ہوا ہے۔

یہ ہے مطلب پرویز صاحب کی سنٹرل زندہ اتھارٹی' مرکز ملت' خلافت علی منہاج النبوت وغیرہ اصطلاحات کا جن کے بغیر امتیں آئینِ نو سے ڈر کر طرزِ کہن پہ اڑ جاتی ہیں۔ محترم مؤلف نے ایک دلچسپ اعتراض برائے اعتراض یہ بھی لگایا ہے کہ مرکزِ ملت وغیرہ جیسی اصطلاحات قرآنِ کریم میں نہیں ملتیں۔ جواباً عرض ہے کہ جس بات کا قرآنِ کریم میں مفہوم ملتا ہو تو آسانی کے لئے اپنی زبان میں کوئی اصطلاح وضع کر لینا غلط نہیں ہو سکتا۔ مثلاً وضو والی آیات میں صرف وضو کے عمل کا مفہوم موجود ہے مگر وضو یا اس کی کوئی بھی متبادل عربی اصطلاح قرآن کریم نے نہیں دی۔ اس کے باوجود محترم مؤلف بھی 'وضو' کی

اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے!

رسول کی زندگی میں تو یہ سسٹم بخیر وخوبی چلتا رہتا ہے مگر رسول کی وفات کے بعد بھی یہ سسٹم رکتا نہیں ہے جیسا کہ آیت 3:144 میں ارشادِ الٰہی ہے: ''اور محمد تو صرف پیغام بر ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے پیغام بر ہو گزرے ہیں بھلا اگر یہ مر جائیں یا قتل ہو جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟'' یعنی کیا پیغمبر کے بعد ان کا قائم کیا ہوا نظام جاری نہ رکھو گے؟ یہ سسٹم رسول کی وفات کے بعد کیسے آگے چلے گا۔ اس کے دو ممکنہ جواب یہ ہیں:

اول: اللہ کی اطاعت (اطیعواللہ) والا حصہ تو بذریعہ قرآن، جبکہ رسول کی اطاعت (اطیعوالرسول) پر عمل بذریعہ احادیث، سنت، تواتر وغیرہ ہوگا جیسا کہ وہ کتابوں میں مذکور یا مشاہدہ میں آتے ہیں۔ اس ضمن میں یہاں ان ذرائع کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

> ''حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے کوئی خاص اسلامی عمل ہی ترک نہیں کر دیا ہے بلکہ ان کی پوری زندگی غیر اسلامی ہوگئی ہے۔ ان کی فکری حالت غیر اسلامی ہے۔ ان کی عملی رفتار غیر اسلامی ہے۔ ان کا دینی زاویہ نگاہ غیر اسلامی ہوگیا ہے۔ وہ اگر اسلامی احکام پر عمل بھی کرنا چاہتے ہیں تو غیر اسلامی طریقہ سے۔ یہ دینی تنزل کی انتہا ہے۔ فی ھولاء القوم لا یکادون یفقو ن حدیثا۔
> (ترجمان القرآن، جلد 2، صفحہ 135)۔

دوم: رسول کی وفات کے بعد خلافت علیٰ منہاج النبوت کا سسٹم یعنی ہر دور میں امت میں خلیفہ الرسول کے طور پر ایک زندہ اتھارٹی یا ادارے کا موجود رہنا (جیسا کہ خلافتِ راشدہ) جو ہر وقت دیکھتا رہے کہ:

(الف) تمام مسائل کا حل قرآن کریم کی روشنی میں بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ہوتا رہے۔ پہلے سے مروج امور بھی جاری رہیں مگر ضرورت آن پڑے تو بذریعہ مشورہ واجتہاد کچھ امور کو تبدیل، معطل یا موقوف بھی کیا جا سکے مثلاً عمرؓ کے دور میں زمینوں کی تقسیم کا مسئلہ۔

(ب) اس کے علاوہ ایسے نئے مسائل جو پہلے موجود نہ تھے اور وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہیں ان کے متعلق بھی قرآنی راہنمائی سے بذریعہ مشورہ واجتہاد تفصیلات طے کی جائیں گی۔ یہ اس لئے کہ قرآن کریم میں لاریب یہ صلاحیت ہے کہ کوئی بھی آنے والا زمانہ قرآنی ہدایت کو پیچھے نہیں چھوڑ سکتا۔ اور قرآن کریم ہر آنے والے دور کے مسائل کے لئے راہنمائی دیتا ہے۔

اب ہمارا موقف یہ ہے کہ اوپر مذکور دو جوابات میں سے آخرالذکر ہی درست ہے کیونکہ سارے قرآن میں اللہ اور رسول کی اطاعت کو دو الگ الگ اطاعتیں نہیں بلکہ ایک ہی اطاعت شمار کیا گیا ہے (مثلاً وَلاَ تَوَلَّوْا عَنْهُ 8:20)۔

اسی بات کو محترم پرویز نے اپنی کتاب معراجِ انسانیت میں صفحہ 315 تا 321 میں بیان کیا ہے جس کی تلخیص یہ ہے: (صرف حوالے دیئے گئے ہیں' متعلقہ آیات قرآن کریم سے دیکھ لیں)۔

(1) اللہ اور رسول کا بلاوا امت مسلمہ کے بلاوے کے معنے میں۔(3:172)

(2) اللہ اور رسول کی مخالفت حکومت اسلامی کی مخالفت کے معنیٰ میں۔(59:4)

(3) اللہ اور رسول سے جنگ حکومتی ڈسپلن سے بغاوت کے معنوں میں۔(5:33)

(4) اللہ اور رسول سے عہد شکنی' سٹیٹ سے معاہدات توڑ دینے کے معنیٰ میں۔(9:1)

(5) اللہ اور رسول کی بیزاری بمعنی مملکت کی معاہدات سے جوابی بریت۔(9:3)

(6) اللہ اور رسول کی کامیابی اسلامی حکومت کے تمکن وتسلط کے معنوں میں۔(58:21)

(7) اللہ اور رسول کا پانچواں حصہ بمعنی مال غنیمت کا پانچواں حصہ امورِ مملکت کے لئے مختص کرنا (8:41)۔ذرا سوچئے کہ آج کل اگر انڈیا سے جنگ میں مال غنیمت ملے تو کون سے رسول کو حصہ دیا جا سکے گا؟

مزید برآں' پرویز صاحب کے ان حوالوں کے علاوہ ایک حوالہ مثلاً یہ بھی ہے کہ آج کے معاشرہ میں آیت 65:1 کے مطابق نبی ﷺ کس طرح عورتوں کو عدت کے حساب سے طلاق دلوائیں گے؟ ظاہر ہے کہ یہاں نبی کی ذات سے بڑھ کر حکومت کے ادارے کی بات ہے۔

''معراج انسانیت'' کے صفحہ 34 پر ہی محترم پرویز آیت 4:59 کے متعلق تحریر کرتے ہیں (مفہوم) کہ یہ غلط ہے کہ اللہ کی اطاعت بذریعہ قرآن' رسول کی اطاعت بذریعہ احادیث اور اولی الامر کی اطاعت بذریعہ حکومت ہوتی ہے۔ دراصل اس آیت میں معاشرہ میں تنازعات کے حل کے لئے ایک نظام اپیل دراپیل دیا گیا ہے یعنی اگر افسرانِ ماتحت' Lower Courts وغیرہ کا فیصلہ کسی کو پسند نہ ہو تو وہ اس ادارے سے بڑے کسی فورم پر اپیل کرنے کا حق رکھتا ہے۔فساد کرنے کی بجائے بڑے مرکز کی طرف معاملہ Refer کرنے کا طریقہ اپنانا چاہئے اور ظاہر ہے کہ آخری یعنی سب سے بڑی اتھارٹی کا فیصلہ سب کو قبول کرنا پڑے گا چاہے وہ امیر المومنین ہو' سپریم کورٹ ہو' پارلیمنٹ ہو' یا مجلس شوریٰ' صدر' وزیراعظم وغیرہ۔فرد ہو یا ادارہ۔نظم ونسق رکھنے اور فساد سے بچنے کے لئے یہ ضروری

ہے۔

آ گے مزید لکھتے ہیں کہ اولی الامر کا مطلب مقامی ماتحت حکام ہونا اسی سورہ (نساء) کی آیت 83 سے ثابت ہے جہاں ارشادِ الٰہی میں رسول کو اولی الامر سے جدا کر کے بیان کیا گیا ہے (صفحہ 323)۔

5- صفحہ 45 پر محترم مؤلف ارشاد فرماتے ہیں:

''دراصل یہی نظریہ اہلِ قرآن' جن کے نمائندہ پرویز صاحب ہیں' ان کا ہے۔ کیونکہ ان کی نظر میں رسول ایک پیغام رساں سے زیادہ کچھ نہیں۔ یعنی جو کام ڈاکیہ کا ہے وہی محمد بن عبداللہ کا تھا اور انہی معنوں میں وہ رسول تھے (نعوذ باللہ نقل کفر کفر نباشد)''۔

اس سارے زورِ بیان کے متعلق ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے سوائے اس کے کہ ''چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد''۔ پرویز صاحب پر یہ صریح بہتان ہے کیونکہ ساری عمر مرحوم یہ درس دیتے رہے کہ رسول صرف چٹھی رساں نہیں ہوتا بلکہ پیغام پہنچانے کے علاوہ کتاب وحکمت کی تعلیم دینا' اپنا اور دوسروں کا تزکیہ کر کے ایک نظام کی لڑی میں معاشرہ کو سجا دینا اس کا کام ہوتا ہے۔ اوپر کا اقتباس دوبارہ پڑھئے اور پھر درج ذیل تقریر پرویز صاحب کی پڑھئے جو 'مطالب القرآن فی دروس الفرقان' میں سورۃ یٰسین کے درس مورخہ 13 جون 1980ء سے مستعار ہے:

''عزیزانِ من! وہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ خدا کا بھیجا ہوا قاصد ہے' جیسے چٹھی رساں چٹھی دے جاتا ہے اور اس کے بعد چلا جاتا ہے۔ اس کی ذات سے اس چٹھی کو کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ آپ نے کبھی نہیں پوچھا ہوگا کہ یہ پوسٹ مین کس قسم کا ہے' کیسا ہے' وہ تو چٹھی دے گیا' چلا گیا۔ اگلی بات اب رسول اللہ ﷺ کی ذات آ گئی۔ وہ محض چٹھی رساں نہیں ہے وہ علیٰ صراطِ مستقیم ہے (36:4)۔ وہ راستہ جو قرآن بتاتا ہے تو وہ اس کے اوپر خود چل بھی رہا ہے۔ یہ محض قاصد ہونا ہی نہیں خود اس راستے پر چلنا ہے۔''

6- مؤلف مذکور کا صفحہ 47 پر ایک عجیب فقرہ پڑھنے کو ملا۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کا نام تواتر ہے!''

ہم تو اپنی ناقص رائے میں یہ سمجھ رہے تھے کہ امر بالمعروف یہ تلقین کرنا ہے کہ سچ بولو' پورا تولو' عدل وانصاف کرو' عموماً سب سے اور خصوصاً ماں باپ سے حسن سلوک کرو وغیرہ اور نہی عن المنکر یہ ہے کہ دھوکا نہ دو' زنا کے قریب بھی مت پھٹکو' شرک نہ کرو' قتلِ ناحق نہ کرو وغیرہ مگر حیرت ہے کہ فاضل مؤلف کے مطابق مندرجہ بالا تمام کام 'تواتر' ہیں۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

اور اگر فاضل مؤلف یہ کہنا چاہتے تھے کہ (امر بالمعروف

نہیں بلکہ) معروف ان رسوم وغیرہ کے معنیٰ میں ہے جو صدیوں سے کسی معاشرہ میں رواج پا چکی ہوں تب بھی یہ تواتر ہمیشہ پسندیدہ نہیں ہوتا۔لوطؑ کی قوم کے تواتر کو قرآن معروف کے معنوں میں نہیں لے سکتا۔ سرحد' سندھ میں کاروکاری' قرآن سے شادی' ونی کی رسوم متواتر تو ہیں مگر معروف نہیں۔

7- کتاب مذکور کے صفحہ نمبر 53 پر تحریر ہے:

''پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ اگر وہ اپنے پاس موجود رسی کو استعمال ہی نہیں کرتا تو خالی التبلغہ اسے پانی تک نہیں پہنچا سکتی۔ اس حقیقت کو ان لفظوں میں بھی لکھا جا سکتا ہے کہ اگر التبلغہ کو استعمال ہی نہیں کرتا تو صرف خالی رسی اسے پانی تک نہیں پہنچا سکتی۔ بات تو ایک ہی ہے لیکن فکرِ پرویز بے نقاب ہوتی ہے اور تبلیغِ رسول نکھر کر سامنے آتی ہے۔''

سمجھنے والوں کے لئے گذارش ہے کہ بات ایک ہی نہیں ہے۔ اگر کنویں کا پانی گہرا نہیں تو التبلغہ باندھنے کی ضرورت ہی نہ ہوگی یعنی صرف اصل رسی ہی پانی تک پہنچنے کے لئے کفایت کرے گی۔

اقتباسِ بالا کے آگے تحریر ہے:

''علم الکتاب کا لازمہ اتباعِ رسول ہے اور یہی ہمارا عملی اسلام ہے جو ہماری زندگی کو قیامت تک کے لئے محیط ہے اور جس عمل پر امت بحیثیت مجموعی کاربند ہے۔''

اس پر تبصرہ اوپر نمبر 4 میں ہم نے کر دیا ہے کہ محترم مؤلف کے ذہن میں ''عملِ رسول'' صرف نماز اور حج کے طریقہ تک ہی محدود ہے۔ موصوف اس سے آگے کی سوچ نہیں سکتے۔

کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں!

چنانچہ صفحہ 57 پر بھی ارشاد ہوتا ہے:

''اگر اللہ تعالیٰ سے محبت اور اخروی نجات کے طالب ہو تو قرآن پر اس طرح عمل کرو جیسے میں کرتا ہوں۔ جس طرح میں اذان' صلوٰۃ' روزہ اور حج ادا کرتا ہوں' اسی طرح تم بھی کرو اپنی طرف سے نئے طریقے ایجاد نہ کر لینا یہ ہے اتبعونی۔''

آپ نے دیکھا پرنالہ وہیں کا وہیں ہے۔ کوئی پوچھے کہ کیا رسول کی اتباع سچ بولنے' انصاف کرنے' غریبوں کی مدد کرنے میں نہیں ہے۔ اصل اسوۃ حسنہ (جیسا کہ تفصیلاً پہلے نمبر 1 میں آ چکا ہے) ہے ہی یہ جس کی اتباع اصلاً مقصود ہے۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

آپ نے نوٹ کیا کہ پہلے فرمایا ''یہی ہمارا عملی اسلام ہے جو ہماری زندگی کو قیامت تک کے لئے محیط ہے'' مگر پھر اس ساری زندگی پر محیط اسلام۔ میں سے صرف نماز

روزہ حج کو بچا کر زندگی کے تمام دوسرے شعبے اور دوائر (Spheres) مثلاً اخلاقیات' عائلی زندگی' معاشرت' تمدن' سیاسیات' عمرانیات' معاشیات' طب وصحت' تاریخ و فلسفہ' آرٹ' سائنس' ریسرچ' دفاع وحرب' بین الاقوامی معاملات وغیرہ سب کو خارج رکھا۔ گویا ان چیزوں کا کوئی تعلق عملی اسلام سے نہیں سوائے نماز روزہ حج کے۔ بس سوئی یہیں اٹکی ہوئی ہے۔ بات کی مزید وضاحت کے لئے ایک مثال پیش خدمت ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے سامنے ان کی عدالت عالیہ میں طلاق کی چند درخواستیں آئیں اور آپ نے تمام Cases میں طلاق نافذ کر دی۔ کیا یہ رسول کا اسوۂ حسنہ' سنت یا تواتر کہلائے گا اور کیا آج بھی ہر مجسٹریٹ پر لازم ہے کہ اس سنت کی پیروی میں علیحدہ علیحدہ ہر کیس کے Merits دیکھے بغیر لازماً طلاق کی ڈگری دے دے؟ یہ ہے وہ مقام جہاں زندہ اتھارٹی' ادارہ یا مرکز ملت (جو بھی کہیں) کی صورت لازمی ہے جو مختلف حالات کے پیش نظر فیصلہ دے کہ کس کیس میں طلاق ہونی چاہئے اور کس میں نہیں۔

8- صفحہ 65 پر مؤلف اپنی یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ رسولِ کریم ﷺ رسول ہونے کے ساتھ ساتھ اولی الامر بھی تھے۔ آپ کے بعد رسالت ختم ہوگئی مگر اولی الامری بطور امیر المومنین جاری رہی۔ محترم کی یہ تھیوری ہے تو خوب مگر افسوس کہ (جیسا اوپر نمبر 4 میں بیان کر دیا گیا ہے) آیت 4:83 اس تصور کے خلاف جاتی ہے کیونکہ اس میں رسول کو اولی الامر نہیں کہا بلکہ رسول کا ذکر اولی الامر سے الگ کیا گیا ہے۔ اولی الامر کو ماتحت افسران کہنا ہی درست ہے یعنی اپیل کا عملی نظام اور گنجائش دینا' لوئر کورٹ کی اپیل ہائر کورٹ میں کر سکنا۔

9- صفحہ 85 پر محترم مؤلف پہلے پرویز صاحب کا مندرجہ ذیل اقتباس نقل کرتے ہیں:۔ (نہ جانے کیوں اپنی اس کتاب میں محترم مؤلف نے اکثر پرویز صاحب کے اقتباسات کے حوالہ جات لکھنا مناسب نہیں سمجھا):

''یاد رکھئے جب تک فیکم رسولہ کا صحیح مفہوم سامنے نہیں لایا جائے گا' نہ مسلمانوں کے اختلافات مٹیں گے نہ امت میں وحدت پیدا ہو سکے گی۔ ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی محفوظ شکل میں موجود ہے۔ اس کتاب عظیم کی بنیادوں پر نظامِ مملکت قائم کر دیا جائے تو دین کی وہی شکل پھر سے سامنے آجائے گی جو عہد رسالتمآب ﷺ اور دورِ خلافتِ راشدہ میں تھی۔''

یہ اقتباس نقل کرنے کے بعد محترم مؤلف پرویز صاحب کی اس تحریر پر یہ تبصرہ وگرفت فرماتے ہیں:

''گویا پرویز صاحب آج بھی بذریعہ رسالت اختلافات کے مٹنے کے قائل ہیں۔ وہ اگر یہاں نظام مملکت کا نام خلافت علی منہاج رسالت تجویز کر دیتے تو معاملہ صاف ہو جاتا اور انہیں نظام

خداوندی اور سنٹرل اتھارٹی جیسے عجمی ناموں کا سہارا نہ لینا پڑتا۔''

جناب مؤلف کے اس تبصرے پر ہم کیا تبصرہ کریں۔ ؎

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

لگتا ہے کہ پرویز صاحب بھی وہی کہتے ہیں جو محترم مؤلف کہہ رہے ہیں۔ جھگڑا ہے تو صرف یہ کہ محترم پرویز ''نظام خداوندی'' اور ''مرکز ملت'' کہنے کی بجائے ''خلافت علی منہاج الرسالت'' کیوں نہیں کہتے! محترم مؤلف کو خوشخبری ہو کہ پرویز صاحب نے اپنی بے شمار تحریروں میں جا بجا اسے ''خلافت علی منہاج النبوت'' بھی لکھا ہوا ہے۔ مزید برآں ''مرکز ملت'' کے جس نام سے جناب مؤلف کو الرجی ہے اس کی تشریح بھی پہلے ہی پرویز صاحب نے اپنی بیش بہا تصنیف ''معراج انسانیت'' کے صفحہ 230 پر اس طرح شروع کی ہے:

قبلہ (مرکز ملت):

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

قوموں کی ہستی کا مدار ان کی مرکزیت پر ہوتا ہے۔ ان کی جداگانہ حیثیت اور امتیازی خصوصیت اسی نقطۂ ماسکہ سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر ان کی مرکزیت میں خلل و انتشار واقع ہو جائے تو ان کی ملی حیثیت کا شیرازہ اس طرح بکھر جاتا ہے جس طرح پرکار کے مرکز (Center) سے ہل جانے سے پورے کا پورا دائرہ بگڑ جاتا ہے۔ قوموں کا خصوصی امتیاز ان کا انداز فکر ہے جو تہذیب و تمدن کے محسوس پیکروں میں دنیا کے سامنے آتا ہے اور تہذیب و تمدن کی محافظ اس قوم کی قوت وسطوت ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اس کے پسِ پشت قوت و اقتدار موجود نہ ہو۔ لیکن یہ قوت و اقتدار بھی ایک مرکز کا محتاج ہوتا ہے اور مرکزی تشتت و خلفشار' بڑی سے بڑی قوتِ قاہرہ کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔''

مختلف اصطلاحات کی لفظی نزاع کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوتی۔ اگر کہنے والے کا مفہوم درست طور پر ذہن نشین ہو جائے تو قبلہ' مرکز ملت' سنٹرل اتھارٹی' نظام خداوندی یا خلافت علیٰ منہاج النبوت وغیرہ کہنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔''

10- مضمون پہلے ہی کافی طویل ہو گیا ہے اس لئے آخر میں چند مختصر تبصرے پیش خدمت ہیں: صفحہ 71 پر درج ہے:

''گویا دونوں فریق کسی نہ کسی طریقہ سے رسالت کے تسلسل کے قائل ہیں۔ ایک بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے

بعد رسالت کے تسلسل کے ہم بھی پوری طرح قائل ہیں۔ لیکن جس طرح مرکز ملت کا تصور غیر قرآنی ہے اسی طرح احادیثِ نبوی کے ذریعے تسلسل قائم سمجھنا بھی غلط ہے۔''

دو مختصر باتیں: اول یہ کہ آپ تسلسلِ رسالت کے نہیں بلکہ تسلسلِ رسول کے قائل ہیں اور دوسرے یہ کہ اگر مرکز ملت کا تصور ہی غیر قرآنی ہے (جیسے آپ کا ارشاد ہے) تو پھر کیا قرآنی تصور ملت کی وحدت و مرکزیت کے بجائے فساد اور انتشار کا ہے؟

11- صفحہ 87:

''اب اس ''نظامِ ہدایت'' کے تحت اللہ تعالیٰ نے عملِ رسول کو تمام انسانوں کے لئے نمونہ قرار دیا۔''

گذارش ہے کہ آپ کے اس ''نظام ہدایت'' کو ہی پرویز مرحوم ''نظام خداوندی'' کہہ دیتے ہیں تو کیا جرم کرتے ہیں؟ دوم یہ کہ عملِ رسول کو تمام انسانوں کے لئے نمونہ ہونے کا کوئی بھی انکار نہیں۔ مگر (جیسا کہ اوپر نمبر 1 میں آ چکا ہے) شک و شبہ سے سو فیصد پاک حقیقی اسوۂ حسنہ قرآن سے ہی ملے گا۔ قرآن کریم میں نہ صرف رسالتمآب ﷺ کا بلکہ ابراہیمؑ اور دوسرے متعدد انبیاء کا اسوۂ حسنہ ہماری پیروی کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہوا ہے۔

12- صفحہ 89 پر رقم طراز ہیں:

''یہاں بھی پرویز صاحب نے آخرت کی کامیابی سے توجہ ہٹانے کے لئے انسان کی زندگی میں ہی آخرت قائم کر دی ہے تاکہ وہ اپنی زندگی کی آسائش و آرام ہی کو آخرت کا عیش و آرام سمجھے۔''

یہ پرویز مرحوم پر بہتانِ عظیم ہے اور ہم اس ''وسواس الخناس'' پر شدید احتجاج کرتے ہیں۔ اگر کوئی سمجھنا چاہے تو پرویز صاحب نے صرف یہ کہا ہے کہ اخروی جنت و خوشحالی کے علاوہ دنیاوی خوشحالی اور جنتی معاشرہ بھی مطلوب ہے اور پرویز نے وہی کہا ہے جو خود قرآن نے متعدد جگہ کہا ہے مثلاً ''اے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت اور بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی'' (2:201)۔ اور ''پوچھو کہ زینت و آرائش اور پاکیزہ کھانا پینا کس نے حرام کیا ہے جس کے استعمال کے لئے اللہ نے ایسی چیزیں اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں۔ کہہ دو کہ یہ چیزیں دنیا کی زندگی میں ایمان والوں کے لئے ہیں اور قیامت کے دن خاص انہی کا حصہ ہوں گی۔'' (7:32)۔ نیز ''اور جو شخص اس دنیا میں اندھا ہو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور دور بھٹکا ہوا۔'' (17:72)۔

13- صفحہ 93 پر فرماتے ہیں:

''رسول امت کی مشاورت کے پابند نہیں''۔

یہ معاملہ اوپر نمبر 3 میں زیر بحث آ چکا ہے' وہاں دوبارہ

ملاحظہ فرمالیں۔

14- صفحہ 95 پر تحریر ہے:

''دنیا کے کونے کونے سے خصوصاً میرے یا آپ کے والدین جن میں اکثریت ان پڑھ خواتین کی بھی ہوتی ہے بغیر کسی روایات یا 'مرکزیت' کی محتاجی کے، بڑے آرام سے اپنے مناسک حج ادا کر کے لوٹ آتی ہیں۔ وہ اس عملِ رسول میں شامل ہوتے ہیں جو صدیوں سے جاری ساری ہیں۔ یہ سب اتباعِ عملِ رسول کی بدولت ممکن ہے۔ صلوٰۃ و حج اور روزہ اور انسان کی پوری زندگی کے لئے کتاب اللہ اور فیکم رسولہ دونوں کافی ہیں۔''

ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا حج کا مقصد صرف رسومات کی ادائیگی ہی ہے۔ حج ہے ہی اس لئے کہ وہاں عالمی ''مرکزِ ملت'' ہے مگر افسوس کہ آپ مرکز ملت کے نام سے ہی چڑ جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے حج کا مقصد یہ بتایا کہ تمہیں اس میں اپنا فائدہ ساتھ کے ساتھ نظر بھی آتا رہے (22:28)۔ مگر ؎

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

15- صفحہ 97 پر ارشاد ہے:

''یہی وجہ ہے کہ یہ تمام اعمالِ متواترہ سبیل المومنین کی صورت میں پوری امت میں جاری ہیں اور جہاں کہیں بھی اگر فرق پیدا ہو گیا ہے وہ کتاب اللہ کے ذریعے درست کیا جا سکتا ہے۔''

ہمارا سوال یہ ہے کہ آپ تو ان تمام اعمالِ متواتر کو رسولی تشریح مانتے ہیں جو کبھی بھی تبدیل نہیں ہو سکتے۔ پھر کتاب اللہ کے ذریعے ان کو کون، کب اور کیسے درست کرے گا؟ ؎

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

آپ کی شکایت

یہ بھی درست کہ رسالہ نہیں پہنچا یا وقت پر نہیں ملا **اور یہ بھی** کہ تعمیل ارشاد میں تاخیر ہوئی یا اس میں کوئی فروگزاشت ہوئی۔ لیکن کیا آپ نے اس پر بھی غور فرمایا کہ آپ نے

1- تبدیلی پتہ کی بروقت اطلاع دی ہے یا نہیں۔ **2- خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر لکھا ہے یا نہیں۔**

3- زرِ شرکت ادا ہوا ہے یا نہیں۔ **4- اپنے علاقے کے پوسٹ کوڈ کی اطلاع دی ہے یا نہیں۔**

(برائے مہربانی اپنا ٹیلی فون نمبر/موبائل نمبر سے بھی ادارہ کو آگاہ کریں) شکریہ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یکے از مطبوعات باغبان ایسوسی ایشن

باغبان ایسوسی ایشن کا ماٹو ''**قرآن فہمی اور باغبانی**'' ہے۔عصرِ حاضر میں مسلمانوں میں وحدت قیادت نہ ہونے کے سبب اغیار ہمیں جدا جدا کر کے مار رہے ہیں۔ باغبان ایسوسی ایشن نے فیصلہ کیا ہے کہ مسلمانوں میں وحدت اقتدار (خلافت) کے سلسلہ میں مقابلہ مضمون نویسی کا انعقاد کیا جائے۔اس سلسلے میں کچھ اشتہار پہلے بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔مقابلہ مضمون نویسی کا عنوان:

﴿قیام خلافت کی راہ میں کون حائل ہے﴾

اس مقابلہ میں مضمون کا پہلا حصہ فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں اور دوسرا حصہ حالات حاضرہ کی روشنی میں ہونا چاہئے جو کہ 5 صفحات سے کم نہ ہو۔مضمون کے لئے یہ شرط بھی ہوگی کہ وہ پہلے قومی پریس میں شائع ہو چکا ہو۔اس سے یہ فکری تحریک اور تیز ہوگی۔ پہلا انعام ایک ہزار روپے نقد اور دوسرا انعام 800 روپے ہوگا۔ایک عام 5 سطری تجویز جو جامع اور موَثر ہو اس پر 500 روپے انعام دیا جائے گا۔شائع شدہ مضامین کی درجہ بندی کے لئے جج پینل تشکیل دے دیا گیا ہے۔ یہ تمام حضرات باغبان ایسوسی ایشن کے تاحیات ممبر ہیں۔

(1) ملک عبدالمسجود' ایم۔اے۔بی۔ایڈ' مری (2) ملک فضل عالم' بی۔اے' راولپنڈی

(3) راجہ محمد صغیر' ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی' قانونی مشیر' مری (4) محمد اشفاق عباسی' ایم۔فل' مری۔

شائع شدہ مضامین وصول کرنے کی آخری تاریخ مع فوٹوسٹیٹ شناختی کارڈ 30 جون 2009ء مقرر ہے۔اگر کوئی معیاری مضمون شائع ہونے سے رہ جائے تو بھی غیر شائع شدہ صورت میں قبول کر لیا جائے گا۔

تقسیم انعامات 14 اگست 2009ء کو ہوگی۔

☆☆☆☆☆☆☆

پتہ رابطہ: **(1) ملک حنیف وجدانی' صدر باغبان ایسوسی ایشن' سنبل سیداں' نیو مری۔**

(2) صبینہ یاسمین' سینئر نائب صدر' باغبان ایسوسی ایشن' ٹبی سیداں' سوہاوہ' جہلم۔

(3) تنویر صادق' نائب صدر' باغبان ایسوسی ایشن' مکان نمبر 6/18' گلی نمبر 1' میاں چنوں' خانیوال۔